اشاعت کا ۹۷ واں سال

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مئی ۲۰۱۹ء

۱۵ روپئے

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

وزیراعظم جناب نریندر مودی، مرکزی وزیر جناب امت شاہ اور اتر پردیش کے وزیراعلیٰ
جناب یوگی آدتیہ ناتھ جی وارانسی میں منعقد استقبالیہ تقریب کے موقع پر (۲۷ مئی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ جی لوک سبھا کے عام انتخابات ۲۰۱۹ء میں
(۶۴) لوک سبھا گورکھپور سیٹ پر کامیابی حاصل کرنے والے امیدوار کی استقبالیہ تقریب کے موقع پر (۲۸ مئی ۲۰۱۹ء)

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات ۲

انتظاریہ

اردو فکشن کی عہد ساز شخصیت؛ قاضی عبدالستار ...... گلشن آرا ۳
شمیم نکہت: مراطرز آہ وفغاں اور ہے ...... عطیہ رئیس ۶

مضامین

قلی قطب شاہ: فنون لطیفہ کا دلدادہ شاعر ...... ڈاکٹر مسرت جہاں ۹
کلام اقبال میں اقدارِ حیات ...... حرا شہاب ۱۱
معین احسن جذبی؛ یادوں کے چراغ ...... مظفر حسین سید ۱۶
نیر سلطانپوری سے ادبی مراسم ...... عالم ندوی ۲۲
غالب اور اقبال ...... محمودہ خاتون ۲۸
بانو قدسیہ کی ناول نگاری ...... ڈاکٹر صفیہ فاطمہ ۳۰
انتظار حسین کے افسانوں میں ہجرت کے مسائل ...... زاہد ندیم احسن ۳۸
عابد سہیل بحیثیتِ خاکہ نگار ...... گلزار حسن ۴۲

افسانے

میں وہی ہوں ...... عطیہ پروین ۴۷
مُن مُن ...... مصطفیٰ علی ۵۰
احساس ...... صالحہ صدیقی ۵۳
بچپن کی دوستی ...... سکندر علی شکن ۵۵

غزلیں

غزلیں ...... بدر واسطی ۵۷
غزلیں ...... رفیع سرسوی، نیاز سلطانپوری ۵۸
غزلیں ...... ذکی طارق، مشتاق جاوید ۵۹
غزلیں ...... بابر شریف، صغیر عابدی ۶۰
غزلیں ...... منور سلطانپوری، بنت زہرا نقوی ۶۱
غزلیں ...... وفا نقوی، مرغوب اثر فاطمی ۶۲

تبصرے

تجزیات بیاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ (مصنف: ڈاکٹر ریحان حسن) ...... ڈاکٹر ارشاد احمد ۶۳
آخری تنکا (مصنف: گلزار سنگھ سندھو) ...... ڈاکٹر منتظر قائمی ۶۴

جلد: ۷۴ شمارہ: ۱

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

مئی ۲۰۱۹ء

پبلشر: ششر
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹوریل بورڈ
شرینواس ترپاٹھی، غزال ضیغم

ایڈیٹر
سید عاصم رضا
فون: 9936673292
Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون
شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ
صبا عرفی
فون: 7705800953

تزئین کار: وقار حسین

تصاویر: فوٹو سیکشن، محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001
Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام ترمشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

بارہ غزلوں سے مزیّن، دس تنقیدی مضامین سے آراستہ اور تین افسانوں کے ساتھ مئی ۲۰۱۹ء کا شمارہ پیش خدمت ہے یہ ایک عام شمارہ ہے لیکن اگر اس کے مضامین پر نظر ڈالیں تو اردو تنقید کے بیشتر رنگ آپ کو اس میں نظر آئیں گے اس لئے یہ شمارہ خود ایک خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔

اس میں سب سے پہلے دو مضامین پچھلے ماہ کے دو گوشوں سے متعلق ہیں، جنہیں ہم نے 'انتظاریہ' کے تحت شائع کیا ہے۔ اس میں ایک مضمون ''اردو فکشن کی ایک عہد ساز شخصیت: قاضی عبدالستار صاحب کی افسانہ نگاری سے متعلق ہے جسے گلشن آرا صاحبہ نے تحریر کیا ہے اور دوسرا مضمون ڈاکٹر شمیم نکہت کی افسانہ نگاری اور دلنواز شخصیت سے متعلق ڈاکٹر عطیہ رئیس کا ہے۔ یہ دونوں مضامین گزشتہ شمارے میں شائع ہونے تھے لیکن ہم انتظار میں تھے اور مضامین بر وقت ہم تک نہیں پہنچ سکے، اس لئے ہم نے انھیں بالکل شروع میں 'انتظاریہ' میں دیا ہے تاکہ آپ کے پچھلے مطالعے سے اس کا سلسلہ مل جائے۔

اس شمارے کے اہم مضامین میں قلی قطب شاہ پر ڈاکٹر مسرت جہاں کا مضمون ہے۔ قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے ادبی تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں لیکن ان کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے وہ اپنے زمانے کی ایسی شخصیت ہیں جس کے زمانے میں فنون لطیفہ کو سب سے زیادہ فروغ ملا اس کی جمالیاتی قدر کو دیکھنا ہو تو اس کے زمانے کی عمارتیں دیکھیں آج سینکڑوں سال بعد بھی ان کا تعمیری حسن اپنی الگ ایک شان رکھتا ہے۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے اپنے مضمون میں خاص طور پر اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالبؔ کے بعد اردو شاعری میں اگر ہم کسی کو عظیم شاعر کہہ سکتے ہیں تو وہ اقبالؔ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا اس شمارے میں اقبال کے حوالے سے ہم دو مضامین شائع کر رہے ہیں۔ ایک میں حرا شہاب نے اقبال کے کلام میں اقدار حیات سے گفتگو کی ہے۔ اقبال کا زندگی کا اپنا ایک تصور ہے جو کسی سے مستعار نہیں ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر آپ کو محسوس ہوگا کہ اقبالؔ نے اقدار حیات کو کس طرح اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ دوسرا مضمون محمودہ خاتون کا غالبؔ اور اقبالؔ سے متعلق ہے یعنی اس میں انھوں نے کوشش کی ہے کہ دو عظیم شاعروں کی شعری خصوصیات کا تجزیہ کیا جاسکے۔

اردو فکشن پر 'انتظاریہ' کے علاوہ تین مضامین اور ہیں۔ بانو قدسیہ اردو فکشن کا ایک بہت بڑا نام ہے انھوں نے 'راجہ گدھ' سے شہرت پائی اور پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، آتش زیر پا، ایک دن، پیا نام کا دیا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک ان کے ناول اور افسانوں کے مجموعے آتے رہے۔ آج ان کا شمار اردو کی اہم ناول نگار میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صفیہ فاطمہ نے اپنے مضمون میں بانو قدسیہ کی ناول نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مضمون مشہور فکشن رائٹر عابد سہیل کی خاکہ نگاری پر گلزار حسن کا ہے، جس میں انھوں نے عابد سہیل کے خاکوں سے بحث کی ہے۔ عابد سہیل کے خاکوں کے دو مجموعے 'کھلی کتاب' اور 'پورے آدھے ادھورے' شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں خاکہ نگاری سے بیحد دلچسپی تھی ان کی خود نوشت 'جو یاد رہا' کو اگر دیکھیں تو اس میں بھی ان کے کئی بہت اچھے خاکے ملیں گے اس طرح گلزار حسن نے ان کی خاکہ نگاری پر مضمون لکھ کر عابد سہیل کو ان کے افسانوں سے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ کا تیسرا مضمون انتظار حسین کے افسانوں میں ہجرت کے مسائل سے متعلق ہے۔ ہجرت کا مسئلہ ایک مخصوص زمانے میں ہمارے ادب میں بہت اہم رہا ہے۔ وطن کے چھوٹنے کا پوری شخصیت اور اس کی نفسیات پر جو اثر پڑتا ہے وہ تا دیر ختم نہیں ہوتا یہی صورت انتظار حسین کے افسانوں کی ہے کہ وہ میرٹھ کے مکان کے صحن میں لگے نیم کے درخت کو کبھی بھول نہیں پائے اور ہجرت خود ان کے افسانوں میں مطالعہ کا ایک حصہ بن گئی۔ زاہدہ ندیم احسن نے بڑی خوبی کے ساتھ انتظار حسین کے یہاں ہجرت کے مسئلہ سے بحث کی ہے ان کے علاوہ اس شمارے میں مشہور شاعر نیّر سلطانپوری پر عالم ندوی کا ایک مضمون شامل اشاعت ہے جس میں انھوں نے نیّر سلطانپوری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بات ضرور ہے کہ ابھی تک ان کے ادبی و علمی کارنامے پر جو کام ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا۔ نیا دور بہت جلد ان کے مجموعی خدمات پر خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اہل قلم حضرات اپنا خصوصی تعاون ضرور دیں گے۔

اس شمارے میں شامل غزلوں کا شروع میں ذکر آچکا ہے ان غزلوں میں زندگی بھی ہے حیات و کائنات بھی ہے اور شاید یہی ان کا حسن ہے کہ ان میں ہمیں زندگی نظر آتی ہے۔ آخر میں منتظر قائمی کا 'آخری تنکا' کتاب پر تبصرہ شامل اشاعت ہے مجھے امید ہے کہ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔ ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔

ابھی ڈاکٹر جمیل جالبی، فہمیدہ ریاض، قاضی عبد الستار اور ڈاکٹر انور سجاد کے انتقال کے غم کو ادبی دنیا بھلا نہ سکی تھی کہ ادیب و نقاد یوسف سرمست نے بھی ادبی دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ یوسف سرمست نے اپنی کتاب 'بیسوی صدی میں اردو ناول' میں اس صدی کے ناول نگاروں، بڑھتے رجحانوں، تبدیل ہوتے موضوعات اور تحریکوں کے زیر اثر تخلیق ہونے والے فکشن کو اپنے اندر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں، نظری اور عملی تنقید، پریم چند کی ناول نگاری، تحقیق و تنقید وغیرہ بھی ادب اور زبان کے فروغ میں نمایاں کردار کی حامل رہی ہیں۔ ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ خدا ان کے ورثا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اپنی بات:

زبان تہذیبی امانت ہے۔ اس کی حفاظت اور فروغ آپ کی ذمہ داری ہے اردو پڑھئے اور اسے فروغ دیجئے۔

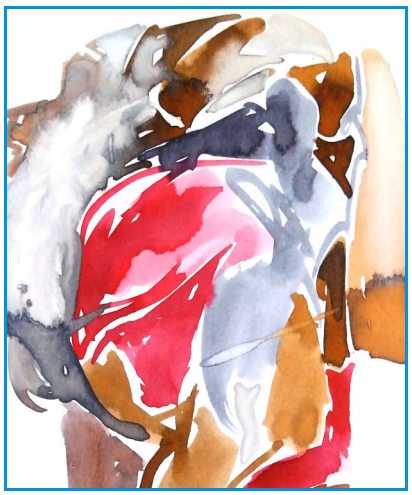

اردو فکشن کی عہد ساز شخصیت: قاضی عبدالستار

گلشن آرا

ریسرچ اسکالر

بی آر اے بہار یونیورسٹی

مظفر پور (بہار)

رابطہ: 7070223675

قاضی عبدالستار کا شمار اردو کے ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اردو افسانہ و ناول کو ایک بالکل ہی نئی سمت اور دِشا روشناس کرایا اور ایک نئی تاریخ رقم کی۔ قاضی صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اردو کے افسانوی ادب کو ایک نئی تازگی و توانائی بخشی اور ایک نیا وقار و معیار عطا کیا۔

قاضی عبدالستار کی پیدائش ۹ر فروری ۱۹۳۳ء کو سیتا پور کے گاؤں مرچھٹہ میں ہوء۔ ان کے خاندان کی ایک بہت بڑی زمینداری تھی۔ قاضی عبدالستار نے میٹرک ۱۹۴۸ء میں اور آئی اے ۱۹۵۰ء میں آر آر ڈی کالج سیتا پور سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بی اے آنرس ۱۹۵۳ء میں اور ۱۹۵۴ء میں ایم اے اردو میں اول مقام اور شنکر شاد گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالستار نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں قنوطیت'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرار وابستہ ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں ریڈر، ۱۹۸۱ء میں پروفیسر اور شعبۂ اردو کے صدر بھی ہوئے۔ ''بحیثیت افسانہ و ناول نگار ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے، مگر انہوں نے دو اہم کتابیں تنقید میں بھی لکھی''۔ اردو شاعری میں قنوطیت اور جمالیات اور ہندوستانی جمالیات کی عظمت و اہمیت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ میں اوپر بھی عرض کر چکی ہوں کہ قاضی عبدالستار کا تعلق اودھ کے ایک مشہور و معروف تعلقدار گھرانے سے تھا اور دور دور تک اس خاندان کی حکمرانی تھی۔ اس لئے قاضی صاحب کی پرورش و پرداخت شاہانہ انداز پر ہوئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے جاگیردارانہ نظام کی شان و شوکت دیکھی۔ تمام عیش و عشرت اور آرائش کے ماحول انہیں موجود و میسر تھیں۔ مگر ایک دور وہ بھی آیا جب قاضی صاحب کی آنکھوں سے جہاں ایک طرف خاندان کا عروج دیکھا تھا۔ زوال کا ڈوبتا ہوا سورج بھی دیکھا۔ ٹوٹتے بکھرتے تہذیبی قدروں کا زوال اور جاگیردارانہ نظام کی پامالی کو بھی قریب سے دیکھا۔ دم توڑتی اور سسکتی ہوئی زندگی کا دل دوز منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کھوکھلی اور جھوٹی وضع داری، ریاکاری اور دکھاوے کی نام و نمائش اور بکھرتا ہوا شیرازہ سب کچھ ان کی کھلی آنکھوں نے دیکھا بلکہ اس کے گہرے اثرات ان کے افکار و خیالات میں ڈھلتے اور پرورش پاتے گئے۔ قاضی عبدالستار نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی شاہدہ محمود بنت چودھری محمود اور دوسری بیوی کوثر ستار بنت عبدالمجید۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹی عابدہ طفیل

اورایک بیٹا معین ستار اور دوسری بیوی سے دو بیٹے ہوئے۔

جدید اردو فکشن کی تاریخ میں قاضی عبد الستار ایک ایسا معتبر و مستند نام ہے جن کی تحریروں میں تہذیبی قدروں کا عروج و زوال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند ادیب ہیں۔

پریم چند کی عظیم افسانوی روایت اور ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات نے قاضی عبد الستار کو اپنے عہد کا ایک عظیم فنکار بنانے میں مرکزی کردار ادا کئے۔ گاؤں ہو یا شہری زندگی تمام جگہوں پر قاضی صاحب نے اپنی بھرپور فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن:

''قاضی عبد الستار کے بھرپور تہذیبی افسانہ ہیں جن میں دیہات کا اُجڑنا اور ابھرنا طبقہ دونوں سامنے آئے ہیں۔ اور اس جیتے جاگتے تہذیبی پس منظر سے قدروں کی شکست و ریخت کا ڈراما تشکیل پاتا ہے۔ قاضی کی یہ کاوش پچھلے دس سالوں کے افسانوں ادب میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے''۔

(ساتویں دہائی کا افسانہ، عصری ادب، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص:۱۳۹)

قاضی عبد الستار کا پہلا افسانہ ''اندھا'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پیتل کا گھنٹہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں پانچ افسانے ہیں۔ محمد غیاث الدین نے قاضی صاحب کے ۲۸/ افسانوی کو مرتب کر کے'' آئینۂ'' ایام نام سے شائع کیا۔ ان تمام افسانوں میں دیہات کی زندگی، شہری زندگی اور تاریخی موضوعات کو انہوں نے نہایت ہی چابکدستی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قاضی عبد الستار کا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' ۱۹۵۴ء میں منظر عام پر آیا اور ہندی میں پہلا ناول ''پہلا اور آخری خط'' کے نام سے ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ رسالہ نقوش (لاہور) کے ناولٹ نمبر (۱۹۶۱ء میں یہی ناول ''رود چراغِ محفل'' کے نام سے شامل ہے۔

قاضی عبد الستار کی تصنیفات میں ''شب گزیدہ (۱۹۶۲) ''مجو بھیا (۱۹۶۳)'' ، ''صلاح الدین ایوبی (۱۹۶۴)''، ''بادل (۱۹۶۵)''، ''غبار شب (۱۹۶۶)''، ''دارا شکوہ (۱۹۶۸)''، ''غالب (۱۹۸۶)''، ''حضرت جان (۱۹۹۰)'' خالد بن ولید (۹۹۵)''، ''تاجم سلطان (۲۰۰۵)'' کے علاوہ کئی تنقیدی و تحقیقی اور تاثراتی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ عین ممکن ہے ابھی کچھ اور بھی غیر مطبوعہ تحریریں ہوں۔

یہ ایک ادبی صداقت ہے کہ قاضی عبد الستار سے اردو ناول کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو میں تاریخی ناول قاضی عبد الستار سے قبل بھی بہت لکھے گئے، مگر کیا بات ہے کہ ان تمام ناولوں سے قاضی صاحب کی عالمانہ و دانشورانہ فہم و ادراک، تخلیقی بصیرت اور آفاقی اذہان کی کمی نظر آتی ہے۔ قاضی عبد الستار کے ایک کامیاب تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں اپنا ایک مخصوص و منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

ان کے تاول و افسانہ میں اپنے عہد کی ہنستی بولتی ٹوٹتی بکھرتی تہذیبوں کا المیہ، اخلاقی قدروں کا زوال، سماجی و معاشرتی جرائم زوال آمادہ معاشرہ کی منظر کشی، وطن کی آزادی، تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات کا ہولناک واقعۂ ہجرت، انسانی خون کی ہولی، دم توڑتی ہوئی انسانیت اور ہماری تاریخ کا ایک ایک سیاہ و سفید ورق قاضی صاحب کی تحریروں میں ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ تاریخ و تہذیب کا حسین امتزاج قاضی عبد الستار کی منھ بولتی تصویریں اور تحریریں آنے والی نسلوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔

قاضی عبد الستار اردو فکشن کی تاریخ میں ایک انجمن ایک ادارہ اور ایک تہذیب اور ایک عہد کا نام ہے، جہاں اودھ کی شان و شوکت و عروج کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کی سسکتی بلکتی ٹوٹتی بکھرتی جاگیردارانہ نظام کی پوری تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں، بقول فکشن کے نامور ناقد پروفیسر قمر رئیس:

''قاضی عبد الستار نئی پود کے نمائندہ ہیں۔ وہ ناول کو قصے کی حیثیت سے دلچسپ بنانے کا گر جانتے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت ہر کردار کو ایک روشن انفرادی پیکر بخشی ہے۔ اودھی بولی کے استعمال سے بھی پیکر بخشی ہے۔ اودھی بولی کے استعمال سے بھی انہوں نے اپنے کرداروں میں ارضیت اور زندگی کی روح پھونکی ہے''۔

(تلاش و توازن، صفحہ:۶۲)

یہ ایک ادبی صداقت ہے کہ قاضی عبد الستار سے اردو ناول کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو میں تاریخی ناول قاضی عبد الستار سے قبل بھی بہت لکھے گئے، مگر کیا بات ہے کہ ان تمام ناولوں سے قاضی صاحب کی عالمانہ و دانشورانہ فہم و ادراک، تخلیقی بصیرت اور آفاقی اذہان کی کمی نظر آتی ہے۔ قاضی عبد الستار کے ایک کامیاب تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں اپنا ایک مخصوص و منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

ان کے تاول و افسانہ میں اپنے عہد کی ہنستی بولتی ٹوٹتی بکھرتی تہذیبوں کا المیہ، اخلاقی قدروں کا زوال، سماجی و معاشرتی جرائم زوال آمادہ معاشرہ کی منظر کشی، وطن کی آزادی، تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات کا ہولناک واقعۂ ہجرت، انسانی خون کی ہولی، دم توڑتی ہوئی انسانیت اور ہماری تاریخ کا ایک ایک سیاہ و سفید ورق قاضی صاحب کی تحریروں میں ہم آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔

تاریخ وتہذیب کا حسین امتزاج قاضی عبد الستار کی منہ بولتی تصویریں اور تحریریں آنے والی نسلوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔ انہیں جہاں ایک طرف زمینداروں وجاگیرداروں کی زوال وپستی سے ہمدردی ہے، وہیں عوامی دکھ درد، انسان دوستی اور کمزور ومظلوم طبقات کی روزمرہ کی زندگی کے لئے فکر مند بھی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر ایک ترقی پسند ادیب ہیں۔ اردو فکشن کے قاضی کے نام سے پوری افسانوی ادب میں اپنی ایک الگ پہچان رکھنے والے قاضی عبدالستار نے جہاں ایک طرف اردو کے داستانی ادب اور قصے کہانی کی قدیم وعظیم روایت کو ملحوظ رکھا وہیں اردو فکشن کے بدلتے ہوئے تجربات ورجحانات کو بھی فراموش نہیں کیا۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور عالمی تاریخ میں اسلامی کرداروں کو ایک نئے سرے سے دریافت کرکے ایک نئی تازگی وتوانائی سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی مخلصانہ و فنکارانہ کاوش کی۔ قاضی صاحب کے افسانے ہوں یا معاشرتی ناول و تاریخی ناول پر مقام و منزل پر انہوں نے اپنی تحریروں میں قصے پن کی دلکشی کو ملحوظ رکھا۔ ''شب گزیدہ'' معاشرتی ناول نگاری میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شاہکار ناول نے اردو فکشن کی تاریخ میں ایک نئی کروٹ لی۔

''شب گزیدہ'' جب پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں منظرعام پر آیا تو پوری اردو آبادی اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوئی۔

اس ناول نے اصل میں قاضی عبدالستار کو اردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کردیا اور معتبر ناقدوں نے اس کی بھرپور تعریف وتوصیف کی اور فکشن کی عالمی شہرت یافتہ ادیبہ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے حوالے سے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

> ''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے، بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے اتنی گہری واقعیت بھی کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوگی۔ ''شب گزیدہ'' کے ایسے ناولٹ اردو میں غالباً نہیں لکھے گئے۔ ''شب گزیدہ'' سے بہتر کہانی قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں''۔

یہ ایک علمی و ادبی صداقت ہے کہ قاضی صاحب نے جس عہد کی شخصیت کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا اس عہد کی تمام تصویریں نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں، تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے انکا مقام ومرتبہ اتنا بلند وبالا ہے کہ اس کی دوسری نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی۔ صلاح الدین ایوبی ''دارا شکوہ'' غالب خالد بن ولید ناولوں میں قاضی عبدالستار نے جن تخلیقی وتاریخی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جن شخصیات پر انہوں نے قلم اٹھایا اس عہد کی تمام تاریخی، سماجی، تہذیبی اور ادبی و ثقافتی صداقتوں کی نہایت ہی فنکارانہ چابکدستی اور خوش اسلوبی سے پیش کرکے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ عہدِ حاضر کے نامور ناقد شمس الرحمن فاروقی قاضی صاحب کی بے پناہ تخلیقی اور تاریخی وتہذیبی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''قاضی عبدالستار Paradoxes کے بادشاہ ہیں۔ ان کا فن ایڈگر ایلن پو کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے قلم میں گزشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ ان کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی صلاحیت ہے جو دو جملوں میں کسی مکمل صورت حال کو زندہ کردیتی ہیں''۔

بحیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو فکشن کی تاریخ میں قاضی عبدالستار کا نام وادبی کام نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ ایک خاص عظمت واہمیت کا حامل بھی۔ جن کی تحریروں کی خوبی، خوبصورتی اور خوشبو دیر اور دور تک سنی جائے گی۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **مصنف کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کے بغیر حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

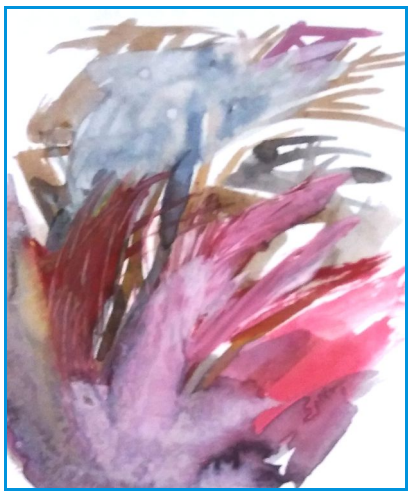

شمیم نکہت: مراطرز آہ وفغاں اور ہے

عطیہ رئیس

3871، کلاں محل

دریا گنج

نئی دہلی

رابطہ: 9968119705

میں نے پروفیسر شمیم نکہت صاحبہ کی صحبت، شفقت اور محبت میں تقریباً ۲۲ برس کا عرصہ گزارا۔ اگست ۱۹۹۵ء میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں ان سے میرا تعارف شعبے کے کوریڈور میں ہوا۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ساڑی میں ملبوس، دراز قد، سنجیدہ مسکراہٹ لئے وہ مجھ سے مخاطب تھیں اور میں مرعوب ہونے کے ساتھ ڈر ڈر کے ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ اس وقت میں ایم فل کا مقالہ جمع کرنے جارہی تھی پھر ہر روز میں پروفیسر شمیم نکہت سے ملنے کے لئے کھڑی رہتی اور وہ بھی میرے انتظار میں رہتی تھیں۔ ایم فل کے بعد جب پی ایچ ڈی میں بطور نگراں ان کے نام کا انتخاب ہوا تو گویا میری آرزو پوری ہوگئی اور خود میڈم بھی بخوشی اس ذمہ داری کے لئے راضی بھی ہوگئیں۔ شعبہ اردو میں وہ پہلی خاتون پروفیسر تھیں اور سجاد ظہیر کی تربیت یافتہ برصغیر ہندو پاک میں ان کا نام افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول ومعروف تھا۔ میرے تحقیقی مقالے اور میری دیگر تحریروں کی اصلاح جس انہما کی اور جاں سوزی سے کی، اس کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے کیونکہ ان کی نگرانی میں ہی میں نے ادبی مراحل طے کئے۔ مجھے ان کی شاگردی میں ایک قسم کا افتخار محسوس ہوتا تھا۔ وہ جب تک دلی میں رہیں میری ہر تحریر ان کی نظر سے گزر کر ہی رسالوں کی زینت بنی۔ جب وہ دلی سے لکھنو چلی گئیں تو ایسا لگا کہ سب کچھ چلا گیا۔ زندگی خالی خالی سی ہوگئی اور میں ادبی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ ایک روشنی تھی جو ان کے رہنے سے میں اپنے اندر محسوس کرتی تھی۔ وہ ایک چراغ تھیں جن کی روشنی سے طلباء منور تھے۔

پروفیسر شمیم نکہت کی شائستگی، ان کی نرمی، ان کی خوش بیانی، ان کی خوش لباسی، ان کی خوش فکری، خوش مزاجی، گویا وہ کون سی ادا تھی جو اُن میں نہیں تھی۔ وہ ایک آئیڈیل خاتون ہی نہیں آئیڈیل ماں، آئیڈیل استاد بھی تھیں جن کی آغوش میں رحمت تھی۔ پی ایچ ڈی میں ان کی نگرانی میں تمام تحقیقی مراحل آسان ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے لکھنا سکھایا اور میری قلم کو روانی عطا کی۔ ریسرچ کے طریقہ کار، کتابیں اور میٹریل جمع کرنا، اور دیگر پیچیدگیاں اور باریکیاں سکھائیں۔ لیکن اس وقت حرف حرف جوڑ کر الفاظ بنانے اس قدر مشکل ہوگئے اور میری قلم کو یارا ہی نہیں ہے کیونکہ جملوں کی نوک پلک تو وہی درست کرتی تھیں۔

اپنے شاگردوں کے لئے بالخصوص طالبات کی کردار سازی کے لئے میڈم ہمیشہ کوشاں رہیں۔علمی و ادبی نگرانی کے ساتھ ساتھ دیگر اصول وضوابط ،زندگی کے نشیب و فراز، سماجی رویوں ،نظریوں ،بد عنوانیوں سے بھی آگاہ کرتی رہتیں تھیں۔طالبات کی ذہن سازی میں ان کی شائستگی کا بے حد مثبت رول تھا ۔میڈم کا ماننا تھا کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں ہی قوم کی ترقی اور خوشحالی میں زیادہ اہم کردار ادا کرسکتی ہیں،بشرط یہ کہ وہ پوری طرح سے اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔وہ گرلز ایجوکیشن کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔وہ لڑکیوں کو زمانے سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتیں،ان کی حوصلہ افزائی کرتیں اور انہیں اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیتیں۔ا۔اُن کے پاس رہنے والی کئی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سرکاری نوکریاں پا چکی ہیں۔میڈم ہم سب کے لئے رول ماڈل رہیں۔بطور نگراں بطور استاد انہوں نے اپنا فریضہ بے حد خوش اسلوبی سے نبھایا۔میڈم جیسی استاد کی کمی شعبہ اردو دانش گاہِ دہلی کو ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی کہ انہوں نے نظامِ تعلیم کو ہر نوع کے ضیاع سے بچائے رکھا۔وہ وقت کی بہت پابند تھیں۔پابندی وقت شعبہ اردو کی طالبات نے ان ہی سے سیکھا۔مارننگ کلاسس میں اسٹوڈنٹ سے پہلے وہ موجود رہتیں۔شعبہ کا clerical staff ان کی پابندی وقت اور مستقل مزاجی کا آج تک قائل ہے۔جو استقلال اور پابندی میڈم نے دکھائی وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔جب وہ شعبہ اردو کی صدر ہوئیں تو ایک ایسا نظام قائم کیا کہ ادبی ماحول میں چار چاند لگ گئے۔شعبے کے اساتذہ انہیں آپا کہہ کر پکارتے تھے اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی محترم اور محبی تھیں۔ہمیں آج اس بات کا دیانت دارانہ اعتراف کرنا ہوگا کہ حقیقتاً پروفیسر شمیم نکہت نے دانشگاہِ دہلی شعبہ اردو سے جو محنتانہ پایا اس کے عوض میں بے مفاد، بے مثال ذمہ داری نبھائی۔

پروفیسر شارب رودولوی جو اُن کے خاوند ہیں اور کسی زمانے میں شعبہ اردو دلی یونیورسٹی میں ہی استاد تھے جو بعد میں جے این یو چلے گئے تھے۔ان دونوں کے درمیان عجیب وغریب ہم آہنگی تھی۔دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ایک دوستانہ رشتہ تھا جو اُنہیں ایک دوسرے سے باندھے رکھتا تھا۔وہ بھی شاگردوں کے ساتھ مہذب سلوک روا رکھتے اور اعلیٰ ذہنیت اور صحت مند تعلیمی ماحول کے حامی رہے۔ دونوں کے بیچ کام اور پابندی وقت کے تئیں ایک عجیب سی mutual understanding محسوس کی ۔ٹیچر اور اسٹوڈنٹ کے درمیانی رشتے کو انہوں نے ہمیشہ maintain رکھا اور یہ فاصلے ان کے اور میڈم کے سبھی شاگردوں کو منظور تھے کسی کی کیا مجال کہ کوئی بے وجہ فرینک ہونے کی ہمت کرے۔خوش لباسی کے لئے دونوں ہسبنڈ وائف پہچانے جاتے۔کسی بھی مرحلے میں یا کسی ذاتی اوقات میں ان کو میں نے بے ترتیب لباس میں نہیں دیکھا۔پروفیسر شارب رودولوی ہم سبھی کو وقتاً فوقتاً disciplined رہنے کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں۔آج کے ماحول میں جب کہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہے،ان کی تعلیم ایسی ہے جس کی اس زمانے میں بہت ضرورت ہے اسی وجہ سے جو عزت اور مرتبہ دونوں کو حاصل رہا وہ انعامِ الٰہی ہے،ایک مثال ہے۔ہما شما اس کے محروم محض ہیں۔

آج بھی ذہن و دل پر کئی باتیں،کئی صدائیں ،کئی ساعتیں نقش ہیں کہ کل سی بات لگتی ہے۔میں جب بھی مورس نگر والے گھر میں جاتی تو ڈور بیل کو لگاتار بجاتی رہتی اور میڈم کی منہ بولی بیٹی ارم کا لال بھبھوکا ناراض چہرہ دیکھتی،وہ منہ بنا بنا کر واپس میڈم کو جواب دیتی ''عطیہ اپی کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے'' ارم مجھے ڈرائینگ روم بیٹھنے کا آرڈر دیتی اور میں ان سنی کر اس کے پیچھے پیچھے میڈم کے کمرے میں چلی آتی۔مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوتیں اور میں بھی مسرور سی اپنا بستہ رکھ کر وہیں بیٹھ جاتی،جس دن سے وہ میری نگراں مقرر ہوئیں تھیں ان کے اور میرے درمیان ایک گہرا رشتہ بن گیا تھا۔میں ان کے لئے possesive رہی اور وہ میرے لئے۔میری جونیر دوست کہکشاں بھی پروفیسر شمیم نکہت کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کر رہی تھی کہکشاں مجھ سے پہلے وہاں موجود رہتی۔امتیاز اور میں نے ان کا نام دادی اماں رکھ چھوڑا تھا۔میں ارم سے پوچھتی ''دادی اماں کب آئی'' بدستور جواب آتا'' آپ سے دو منٹ پہلے''۔تھوڑی دیر بعد اسکالرز کی دوسری جماعت جن میں امتیاز احمد ،عمر فاروق، طاہرہ منظور،خان احمد فاروق، ارشاد احمد،ندیم احمد، اور جے این یو سے محمد کاظم پہنچ جاتے۔میڈم خوش دلی سے سب کو بٹھاتیں، کھانے کا وقت ہوتا تو ڈائننگ ٹیبل پر پورے جتھے کے لئے کھانا لگ جاتا۔اور ایک ایسی محفل جمتی کہ گھنٹوں پر محیط ہوتی،ادب کے موضوعات پر بحث ہوتی شارب صاحب بھی شامل رہتے اور سب کی سن لینے کے بعد قولِ فیصل سناتے۔پرانی دلی سے لے کر بہار ،یوپی ،ریسرچ فلور ،لائبریری، کینٹن ریسرچ ٹاپک،سیاسی اتار چڑھاؤ سب ہی کچھ ڈسکس کئے جاتے۔بحث کبھی گرم بھی ہوجاتی اور میڈم سب کی باتوں میں شریک بھی رہتیں اور خوشی خوشی سب کی طرف ڈشس بھی بڑھاتی جاتیں۔روٹی کی چنگیری میں ایک بھی روٹی باقی نہیں رہتی۔وہ بڑے ہی خوشگوار دن تھے۔میڈم کا وہ گھر سب کو اپنا گھر لگتا تھا اور سب کے سب عقیدت مندوں کی طرح وہاں جمع رہتے تھے۔میڈم کی یا شارب سر کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔

ایک اور بات جو ذہن و دل سے کبھی محو نہیں ہوگی،یہ ۱۹۹۸ کا ذکر ہے کہ جب میں نے اور ڈاکٹر امتیاز نے اپنی ایک مشترکہ کتاب 'ارمغان ادب' کا مسودہ میڈم اور شارب سر کو دکھایا تو ان دونوں کے مفید مشوروں سے یہ کتاب ترتیب دی،ہم دونوں کی بہت

زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی اور اس حوصلے سے ارمغانِ ادب کی کتابت، طباعت اور اشاعت کے سارے مرحلے آسان ہوتے گئے۔ایم آر پبلی کیشنز نے اس کتاب کوشائع کیا۔اس پبلی کیشنز کی تشکیل وتعمیر میں بھی پروفیسر شارب رودولوی کے بہترین مشورے شامل ہیں۔آج یہ ادارہ ۵۰۰ سے زیادہ ٹائٹل شائع کر چکا ہے،اس کے مالک میرے چھوٹے بھائی عبدالصمد ہیں اور آج بھی بوقتِ ضرورت پروفیسر شارب رودولوی سے رجوع کرتے ہیں۔پروفیسر عتیق اللہ صاحب اس وقت شعبہ اردو کے صدر تھے،انہوں نے ہاتھوں ہاتھ 'ارمغانِ ادب' کا اجراء شعبہ اردو دلی یونیورسٹی میں کرنے کا مشورہ دیا اور خوشی خوشی دیگر انتظامات بھی کئے۔مزید ہمارے حوصلوں کو پرواز عطا ہوئی۔شعبہ اردو کے تمام اساتذہ نے رسمِ اجراء کے وقت کتاب کی بہت تعریف وتوصیف کی بالخصوص پروفیسر عبدالحق صاحب نے،تو ہماری خوشی کے ٹھکانے نہ رہے۔شام کو ہم سب واپس مورس نگر میڈم کے گھر پہنچ گئے اور ارمغان ادب کی اجراء کی پریس رپورٹ (جو کہکشاں لطیف نے جلدی جلدی شعبے میں اجرا کے وقت لکھا تھا) شارب سر نے نوک پلک درست کر کے ہندو ستان کے ۳۲ اخباروں میں فیکس کرادی۔آناً فاناً 'ارمغان ادب' کا شہرہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہوگیا۔پھر کیا تھا دوسرے دن سے ہی 'ارمغان ادب' کے لئے مبارکباد اور خطوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔اُس دن میڈم نے خوشی خوشی مجھے انعام بھی دیا جو آج بھی محفوظ ہے۔

کہی ان کہی کئی یادیں کئی باتیں ہیں جو یادداشت میں محفوظ ہیں چونکہ اندرون خانہ مجھے آنے جانے کی اجازت تھی ،میں ان کے گھر کی ذاتی مجلسوں اور محفلوں میں شامل رہی ہوں اس لئے میں ان محفلوں کی امین بھی ہوں۔ان کا مقام جو میرے دل میں ہے اسے کوئی لے سکتا۔بقول شارب صاحب :

اس شہرِ بے یقین سے وہ مہتاب لے گیا
اپنی شناخت کے تھے جو اسباب لے گیا

جب وہ دہلی چھوڑ کر مستقل طور پر لکھنو شفٹ ہو رہی تھیں تو نئی دھلی ریلوے اسٹیشن پر ان کو رخصت کرنے کے لئے میرے ساتھ میری والدہ ، بھائی عبدالصمد،میری بہن صبیحہ سلطانہ، کہکشاں لطیف،امتیاز احمد،،عمر فاروق اور شارب سر کے بھانجے شبیب بھائی اور حبیب بھائی موجود تھے۔رو رو کر سب کا برا حال

ایک اور بات جو ذہن و دل سے کبھی محو نہیں ہوگی، یہ ۱۹۹۸ کا ذکر ہے کہ جب میں نے اور ڈاکٹر امتیاز نے اپنی ایک مشترکہ کتاب 'ارمغان ادب' کا مسودہ میڈم اور شارب سر کو دکھایا تو ان دونوں کے مفید مشوروں سے یہ کتاب ترتیب دی، ہم دونوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی اور اس حوصلے سے ارمغانِ ادب کی کتابت، طباعت اور اشاعت کے سارے مرحلے آسان ہوتے گئے۔ایم آر پبلی کیشنز نے اس کتاب کوشائع کیا۔اس پبلی کیشنز کی تشکیل وتعمیر میں بھی پروفیسر شارب رودولوی کے بہترین مشورے شامل ہیں۔آج یہ ادارہ ۵۰۰ سے زیادہ ٹائٹل شائع کر چکا ہے،اس کے مالک میرے چھوٹے بھائی عبدالصمد ہیں اور آج بھی بوقتِ ضرورت پروفیسر شارب رودولوی سے رجوع کرتے ہیں۔پروفیسر عتیق اللہ صاحب اس وقت شعبہ اردو کے صدر تھے،انہوں نے ہاتھوں ہاتھ 'ارمغانِ ادب' کا اجراء شعبہ اردو دلی یونیورسٹی میں کرنے کا مشورہ دیا اور خوشی خوشی دیگر انتظامات بھی کئے۔

تھا،میڈم کی آنکھوں میں آنسو تھے جن کو بار بار وہ روکنے کی کوشش کرتیں لیکن ناکام رہتیں۔گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔سر نے سب کو اترنے کے لئے کہا،سب لوگ اتر گئے لیکن کہکشاں اور میں میڈم کے پاس سے اٹھنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ارم بار بار کہتی ''اپی خدا حافظ''۔میں کہتی ''ارم خاموش رہو' جب کہ ارم نے بھی میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔آخر کار شارب سر کے کہنے سے ہم دونوں ٹرین سے اترے۔نم آنکھیں لئے ان کو رخصت کیا۔

لکھنو جانے سے تین چار مہینے قبل تک میں نے انہیں دلی میں روکنے کے لئے پورا زور لگالیا'' دریا گنج میں بڑے کشادہ اور سستے فلیٹ میں مل رہے ہیں آپ لکھنو نہ جائیں''میرا روز کا یہی جملہ اور معمول رہتا۔میں اکثر فلیٹ تلاش کرنے خود ہی نکل جاتی انصاری روڈ پر کشادہ فلیٹس کی قیمت اور کرایہ معلوم کرتی ،پھر فون پر ان کو بتاتی۔لیکن فیصلہ لکھنو کے حق میں ہی ہوا قدرت کو یہی منظور تھا۔یہاں سے جانے کا قلق ان کو تا حیات رہا۔وہ مجھ سے دل کی ہر بات شیئر کرتی تھیں۔

فروری ۲۰۱۶ء میں علی گنج میں ان کے خوبصورت سے گھر میں میری میڈم سے آخری ملاقات ہوئی۔وہ مجھے،امتیاز اور میرے بیٹے فراز احمد کو دیکھ کر خوشی سے کھل گئیں۔اتنی خوشی کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔بیمار تھیں لیکن ہم کو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں،فراز کو پیار کیا،عبدالصمد اور میری بہن صبیحہ کی خیریت دریافت کی۔شعبے کی بابت پوچھ گچھ کرتی رہیں۔کبھی خوش،کبھی ایک دم چپ ہو جاتیں تھیں۔پُرتکلف ڈنر ہمارے لئے تیار کروا دیا تھا،باوجود تکلیف کے ڈائننگ ٹیبل پر ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا۔شارب سر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میڈم کا dylisis چل رہا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرہ پر وہی شفیق سی مسکراہٹ تھی۔درد و تکلیف کی انتہا تھی لیکن زرہ برابر اظہار نہیں ہونے دیا۔جو لوگ نعمتِ اخروی پر کامل یقین رکھتے ہیں ان کو کوئی درد کوئی رنج رنجیدہ نہیں کرتا۔وہاں سے آنے کے بعد وہ چند مہینے زندہ رہیں اور پھر ہم سب سے رخصت ہوئیں اللہ ان کو اپنی جوارِ رحمت میں رکھے۔

❑❑❑

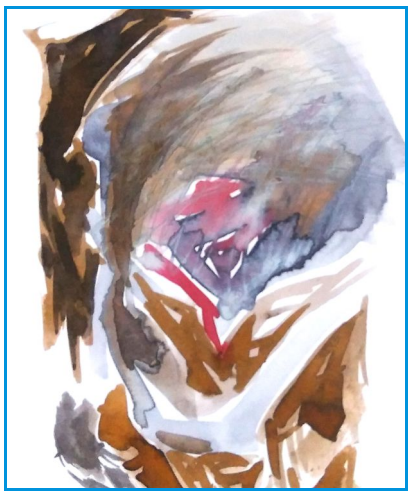

قلی قطب شاہ: فنون لطیفہ کا دلدادہ شاعر

ڈاکٹر مسرت جہاں

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد (تلنگانہ)

رابطہ: 9392458085

عہد قطب شاہی کا پانچواں فرمانروا محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اُس نے شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی شاعری میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ کھلے دل و دماغ کا بادشاہ تھا۔ اُس کے دل اور دربار میں ہر مذہب و ملت کے لیے جگہ تھی۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی کی رسائی اُس تک تھی۔ وہ انصاف پسند بادشاہ تھا جو ہر کسی سے محبت کرتا تھا اور سبھی کو یکساں مقام عطا کرتا تھا۔ اُس کی شاعری اِن ہی خصوصیات کی عکاسی کرتی ہے۔

قلی قطب شاہ کا دور خوشحالی اور امن و آشتی کا دور تھا۔ عوام خوش اور مطمئن تھے۔ بادشاہ کا اپنی رعایا اور اُن کے روزمرہ کے معاملات سے راست تعلق تھا۔ عوام کی زندگی گرچہ قلعے سے باہر کی سرگرمیوں پر محمول تھی تاہم سلطان کو عام لوگوں کے مسائل اور اُن کی ضروریات سے پوری طرح واقفیت تھی۔ اس کا اظہار اکثر عوامی جلسوں، تہواروں اور تہذیبی اجتماعات کے موقعوں پر ہوتا تھا۔ محرم کے ساتھ ہولی کو بھی اہمیت حاصل تھی۔ اور ایسے کئی مواقع آئے جب محمود و ایاز بغلگیر نظر آتے تھے۔ یہ عوامی اختلاط اور عوام کے اندر فرقہ وارانہ ہم آہنگی نہ صرف عوام کو آپس میں ایک دوسرے سے قریب کیے ہوئے تھی بلکہ بادشاہ وقت پر اُن کے اعتماد کو توانائی بخشتی تھی۔ یہ وہ صورتحال ہے جس کے سائے میں قلی قطب شاہ کی شاعری پروان چڑھی لہٰذا فطری طور پر اُن کے وہی موضوعات بن گئے۔ اور غیر شعوری طور پر نظم ہوتے چلے گئے جن سے سلطان یعنی شاعر کو شب و روز کا واسطہ تھا۔

نظیر اکبرآبادی کو پہلا عوامی شاعر کہا جاتا ہے مگر جب ہم قلی قطب شاہ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظیر اکبرآبادی کے تمام موضوعات اپنی گوناگوں خصوصیات اور رنگینیوں کے ساتھ قلی قطب شاہ کے یہاں موجود اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ نظیر نے عوام میں رہ کر عوامی شاعری کی جبکہ قلی قطب شاہ نے خواص میں رہ کر اور بادشاہ وقت ہوتے ہوئے اِسی طرح کی شاعری کی۔ یہ خصوصیت قلی قطب شاہ کو ایک امتیازی مقام پر فائز کرتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم دونوں کے عہد پر نظر ڈالتے ہیں اُن میں کم و بیش دو صدیوں کا فاصلہ دِکھائی دیتا ہے اور یہاں بھی قلی قطب شاہ کو اولیت حاصل ہے۔

قلی قطب شاہ زندہ دل' جواں دل اور خوش مزاج بادشاہ تھا جو انتہائی قادرالکلام شاعر تھا۔ اُس کی شاعری میں یوں تو پوری عوامی' سماجی اور تہذیبی زندگی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے لیکن اُس کی ایک خصوصیت کی طرف بطور خاص اشارہ کرنا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اُس نے اپنی مملکت میں فنون لطیفہ کی مختلف اقسام کے فروغ میں عملی کردار ادا کیا اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ اُس کے دربار تک فنکاروں کی رسائی تھی۔ وہ خوشحال سلطنت کا نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ شاعری' فن تعمیر' موسیقی' مصوری سے بھی اُسے فطری میلان تھا۔ سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''اُس کے دور حکومت کے فن تعمیر کے نایاب نمونے اُس کے اعلیٰ ذوق کے مظہر ہیں۔ سعیدہ آباد اور میر پیٹھ کی مسجدیں فن تعمیر کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ چار مینار' گگن محل' خداداد محل' محل کوہ طور' سجن محل' اعلیٰ محل کی جھلک ہمیں نہ صرف محمد قلی کے کلام میں نظر آتی ہے بلکہ گلزار آصفیہ ''تاریخ ظفرہ'' 'حدیقۃ سلاطین' 'تاریخ قطب شاہی' اور 'حدیقۃ العالم' میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔'

(ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ کلیات قلی قطب شاہ۔ ص 51)

قلی قطب شاہ کے بسائے ہوئے شہر حیدرآباد' چار مینار اور دیگر چیزوں کو بلاشبہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ان تمام کی حسن ودلکشی کی شہرت سن سن کر لوگ اسے دیکھنے آتے تھے اور دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ مورخین نے خصوصاً ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کافی تعریف کی ہے اور اس کا سہرا بادشاہ کے سر باندھا ہے۔ محمد قلی کو خوش نویسی کا بھی شوق تھا اور اسی شوق کی خاطر اس نے ایران و اعراق سے استاد بلوائے تھے۔ حیدرآباد کی عمارتوں' مساجد کی محرابوں اور کتبوں میں اُن کے خطوط کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کی فن تعمیر میں دلچسپی سے متعلق سیدہ جعفر فرماتی ہیں:

''جامع مسجد کا بیرونی دروازے کا کتبہ خط نستعلیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اسی مسجد کی محراب کا کتبہ خط نسخ کا بے مثل کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حروف کی نشست' قلم کا زور' دائروں کی گولائی اور ہاتھ کی صفائی وخوش خطی قابل دید ہے۔''

(ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ کلیات قلی قطب شاہ۔ ص 52)

قلی قطب شاہ کو مصوری سے بھی لگاؤ تھا۔ ابوالاعجاز صدیقی ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' میں لکھتے ہیں:

''کوہ ودمن اور فضائے بسیط میں پھیلا ہوا صحیفہ فطرت ہر دور میں دامن کشِ دل رہا ہے۔ چنانچہ مناظر فطرت کی عکاسی ہر بڑے شاعر کے یہاں موجود ہے۔ فرخی' منوچہری' خاقانی' محمد قلی قطب شاہ' میر حسن' نظیر اکبرآبادی' انیس' اقبال اور جوش کے یہاں مناظر فطرت کے نہایت دلنشیں مرقعے موجود ہیں۔'' (ص۔179)

بہمنی سلطنت کی پانچ ٹکڑیوں میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی کے عہد میں ادب کو فروغ حاصل ہوا اور دونوں ہی سلطنتوں میں مصوری کی ترقی ہوئی۔ اس دور میں مصوروں نے ہرے رنگ کا بطور خاص استعمال کیا جو دہلی کے فن مصوری سے مختلف تھا۔ دکنی بادشاہوں کے عہد میں مختصر کینوس میں چھوٹے چھوٹے ڈیزائن پیش کیے جاتے تھے۔ کلیات قلی قطب شاہ کے تفصیلی مقدمے میں پرسی براؤن کی کتاب ''انڈین پینٹنگ'' ڈاکٹر ایچ گوٹز کی کتاب ''انڈین آرٹ اینڈ لیٹرس'' کے علاوہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دہلی قلم کے مقابل دکن کے فن مصوری کے مخصوص طرز کو دکنی قلم سے تعبیر کیا جاتا تھا اور محمد قلی قطب شاہ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ فن مصوری میں قلم سے مراد طرز لیا جاتا ہے جو کسی مخصوص خطے کے انداز اور مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ دہلی قلم اور دکنی قلم سے بھی وہی مراد ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دیوان کا جو قدیم ترین نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے اُس میں محمد قلی کی عیش پرستانہ زندگی سے متعلق متعدد تصاویر شامل ہیں جو اُس عہد کے فن مصوری کی عکاس اور ترجمان ہیں۔

قلی قطب شاہ کو موسیقی اور اشعار کی موسیقیت سے بھی خصوصی شغف تھا۔ محمد قلی بحروں کا انتخاب اپنے ذوق کے مطابق کرتے تھے۔ اُنہوں نے مترنم بحریں استعمال کی ہیں اور ردیف وقافیے کی مدد سے آہنگ پیدا کی ہے۔ محمد قلی کے مزاج کی مناسبت کی وجہ سے اُس کے محلوں میں رقص وموسیقی کی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر اُسی نوعیت کی محفلوں سے شاہی محلات کے رونق میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ وہ موسیقی کا اتنا بڑا رسیا تھا کہ کسی خوبصورت اور نازک کیفیت یا صورتحال کی منظر نگاری اور مرقع کشی کرتے ہوئے بھی موسیقیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کے کلام میں جا بجا ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں موسم برسات کی منظر نگاری کرتے ہوئے' موسم بہار کا بیان کرتے ہوئے' کوئل اور پپیہوں جیسے پسندیدہ پرندوں کی مثالیں پیش کرتے ہوئے موسیقیت محسوس کی جاسکتی ہے۔

بلاشبہ قلی قطب شاہ کی شخصیت بہت تہہ دار تھی۔ وہ بحیثیت بادشاہ ذی فہم' منصف اور بہادر تھا۔ رعایا کا بادشاہ پر اعتماد اور بادشاہ کو رعایا سے لگاؤ اور امن پسندی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایک بلند پایہ بادشاہ کی خصوصیات سے مزین تھا۔ لیکن ساتھ ہی فنون لطیفہ سے اُسے فطری وابستگی تھی جس کی بہترین مثالیں حیدرآباد اور یہاں کی خوبصورت عمارتوں اور خود اُس کے کلام میں ملتی ہیں۔

❑❑❑

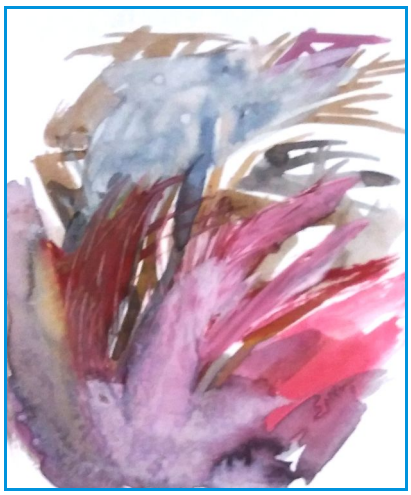

کلام اقبال میں اقدار حیات

حرا شہاب

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی

الٰہ آباد

رابطہ: 7238970214

موضوعات کا تنوع، اسلوب کا نیاپن، استعارات کی ترفگی، تشبیہات کی دوشیزگی سے اقبال ایسی سحر کارانہ کیفیت پیدا کرتے ہیں کہ ہر گز رگاہ خیال پر ایک مغنیٔ آتش نفس کے مضطرب ساز کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قرون اولیٰ کے غزوات نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ہو یا صحراؤں میں اللہ اکبر کی تکبیریں گونج اٹھیں ہوں یا کسی مجاہد کی آنکھیں میدان محاربہ میں شراریں برسا رہی ہوں۔ اقبال کسی عہد کے شاعر نہیں بلکہ وہ خود ایک عہد، ایک زمانہ، اور ایک شخصیت کا نام ہے جو طلسم زمان و مکاں کو توڑ کر ابدیت کی منزل تک پہنچ کر یہ بتاتے ہیں کہ مسافر یہی تیرا نشیمن ہے۔ اقبال کی شاعری تخریب و تعمیر کی کشمکش میں زندگی کو آگے بڑھانے کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اقبال اپنے فلسفیانہ افکار کے ذریعے قوم کو ہی بیدار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کا اصل ہدف انسانیت ہے، وہ خود کہتے ہیں:

تقسیم ملل ہمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

اقبال آدم کو اس زندگی کا نکتۂ آغاز قرار دیتے ہیں اور آدم کے زمین پر آنے کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

وہ اشارہ کرتے ہیں کہ وہ انسان جو کل تک ملائکہ کے حسن دل فریب کا مثالی نمونہ تھا وہ اب مادیت کی دنیا میں آ کر فرشتوں کی اداؤں کو بھول کر وقت کے آئینے میں خود اپنے اعمال کا محاسبہ کرے گا۔ اقبال کا اصل موضوع انسان ہے۔ اور انسان کے لئے جو شرائط ضروری ہیں انھیں سے انسانیت عبارت ہے اور یہ انسانیت نیابت الٰہیہ کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے انسان کو ملی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''آفتاب جس کی عظمت و جلال نے نہ صرف ابراہیم کی باریک بین نگاہوں کو دھوکے میں ڈال دیا تھا بلکہ ایک مہذب قوم کے دل و دماغ کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ اب اپنی حرارت اور روشنی کو حضرت انسان کے اشارے پر صرف کرتا ہے۔ غرض کہ نظام قدرت کے وہ تمام قوا جن کے ناقابل تشریح عمل سے مرعوب ہو کر قدیم قومیں انہیں ربوبیت کے لباس سے مزین کر کے ان کے عظیم الشان معابد تعمیر کیا کرتی تھیں، موجودہ علوم کی وساطت سے انسان کے دست بستہ غلام ہیں اور یہ ظلوم وجہول اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھائے جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ اپنے اشرف المخلوقت ہونے پر بجا ناز کر رہا ہے اس کی مستفسرانہ نگاہیں قدرت کے سربستہ رازوں کو کھول رہی ہیں اور اس کا دماغ ہی ان علمی فتوحات کے سہارے پہاڑوں، سمندروں دریاؤں حتیٰ کہ چاند، سورج اور ستاروں پر بھی حکومت کر رہا ہے۔''(۱)

اور جب یہ کہا گیا کہ ''اِنّی جاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفہ'' تو ملائکہ کو اس پر اعتراض ہوا۔ مگر انسان نے اس دنیا میں آ کر خلافت الٰہیہ کا جو تاج اس کے سر پر رکھا گیا تھا اس کی عظمت کو نبھاتے ہوئے اپنا فرض پورا کیا۔ جو کل تک فرشتوں کی ادائیں دیکھ رہا تھا آج اپنے عمل سے اس پیکر خاکی کو ایک جنت ارضی کی تعمیر کرنی ہے انسان کی ساری عظمت اس کے عمل میں پوشیدہ ہے اس عمل سے جنت بھی بنے گی اور وہ اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بھی بنا دے گا اس لئے اقبال وضاحت کر دیتے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان کی سرشت میں خیر و شر کی کشمکش ازل سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ اقبال آیۂ شریفہ ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سٰفلین۔'' کی روشنی میں معرکۂ خیر و شر کو ازلی اور ابدی قرار دیتے ہیں۔ احسن تقویم سے اسفل سٰفلین ٹکراتا رہے گا۔ اقبال کہتے ہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

یہی بات ان کی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے بھی واضح ہوتی ہے۔ اقبال اس معرکۂ خیر و شر کو اپنی پوری شاعری کا مرکز و محور بناتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ سلسلہ حضرت آدم کے وجود میں آتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ بہت واضح لفظوں میں یہ بتاتے ہیں کہ خیر کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے شر کا وجود ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر شر نہیں ہوگا تو خیر کی قوتیں برسر کار نہیں آ سکتیں۔ چنانچہ ابلیس جسے وہ خواجۂ اہل فراق کہتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ ابلیس کی وجہ سے مشت خاکی میں ذوق نمو ہے۔ ابلیس نے جرأت انکار کا سبق دیا ہے اور لامتناہی جدائی کا داغ برداشت کر رہا ہے۔ وہ یقیناً انانیت کا شکار تھا۔ اقبال نے اس کی انانیت برقرار رکھی ہے۔ چنانچہ جب اس سے جبرئیل پوچھتے ہیں کہ یہ جہان رنگ و بو کیسا ہے؟ تو ابلیس کسی لمحہ بھی اپنی انانیت سے گریزاں نظر نہیں آتا جبرئیل کے جواب میں اسی طنطنے سے کہتا ہے کہ یہ جہان رنگ و بو میں سوز وساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں جبرئیل کی دنیا بے رنگ ہے یہاں سوز نہیں ہے۔ ابلیس کی دنیا میں سوز ہے یہ سوز عشق ہے، ساز فراق پر گایا ہوا ایک بے چین نغمہ ہے جو درد سے بھرا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ جب درد ہے تو وہ بقول میر تقی میر:

اب جس جگہ پہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

یہ درد و داغ کی زندگی یہ سوز و ساز کی فضا دراصل انسان کی قوت عمل کو ابھارتی ہے، اسے جگاتی ہے سلاتی نہیں بلکہ اس میں تجسس کو پیدا کرتی ہے کہ یہ تجسس آرزوؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ تمناؤں کو جگاتا ہے خلش اضطراب کو بیدار کرتا ہے۔

اقبال نے اسی عشق کو روایات کے آئینے میں تاریخی صداقتوں سے ہم آہنگ کر کے پوری ملت آدم کو یہ سمجھایا کہ عشق کیا ہے:

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفی
عشق خدا کو رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی تشریح کرتے ہوئے اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عشق کی کیفیات عالم امکاں میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ پیکر گل پر اگر نظر ڈالئے تو یہ احساس ہوگا کہ جب تک اس میں عشق کی مستی ہے وہ لہلہاتا ہے اگر اس سے عشق چھوٹا تو وہ مرجھا کے اپنی تابناکی ہی نہیں کھوتا بلکہ اپنی شناخت و پہچان بھی کھو دیتا ہے:

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق ہے نور حیات عشق ہے نار حیات

انھوں نے عشق کو صہبائے خام کہا ہے یعنی کہ کچی شراب کیوں کہ کچی شراب میں نشہ بہت تیز ہوتا ہے اور سرور آگیں کیفیت عشق کے ذریعے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اور فضائے بسیط کو

عاشق کی گرفت میں لے آتی ہے۔اور جب نشے کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو یہی عشق شراب کا ایسا پیالہ بن جاتا ہے جو انسان کو مکرم بنا دیتا ہے۔

اقبال نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ عشق کو دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ جو بلیغ اشاریت فقیہ حرم میں ہے وہ اسلامی تاریخ کے اوراق کو اپنے تمام روشن حروف کے ساتھ پیش کر دیتی ہے۔اس لئے کہ پہلے مرحلے میں مسلمانوں کو یہی جاننا تھا کہ اسلامی اصول کیا ہیں؟ فقہ نے یہی بتایا کہ نماز کیا ہے؟ روزہ کیا ہے؟ حج کب واجب ہوگا؟ زکوٰۃ کب نکلے گی؟ ان شرائط کی ادائیگی کے بعد جہاد کی منزل ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تلوار لے کر چڑھ دوڑے۔ جہاد باللسان بھی ہے لیکن جہاد کی سب سے پہلی منزل جہاد بالنفس کی ہے یعنی اپنے نفس کی طہارت اور پاکیزگی۔ بقیہ منازل میں تلوار یا اسلحہ اس وقت اٹھے گا جب اپنا دفاع کرنا ہوگا۔اسلام نے جارحیت (Aggression) کو جہاد نہیں کہا۔ اس طرح اسلامی اصولوں میں وسیع تر پیمانے پر ساری دنیائے انسانیت کی تطہیر کا جذبہ ہے ۔اسلام ملت آدم کو سرخرو اور تابناک دیکھنا چاہتا ہے۔ مقصد حیات بھی واضح کر دیا گیا ہے یعنی تسخیر فطرت اور اس سے ہم آہنگی۔

صرف ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتی ہوں صبح کو جب سرخی پھیلی ہوتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور تھپک تھپک کر ہمیں سلانے کی کوشش کرتی ہیں اس وقت سے جہاد شروع ہو جاتا ہے۔ ہم فطرت سے لڑتے بھی ہیں اور خود کو اس سے ہم آہنگ بھی کرتے ہیں۔ اللہ اکبر کی صدا بلند کر کے ہم ہواؤں کی تھپکیوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے جاؤ دریاؤں کی روانی کو گدگداؤ، ہنساؤ اور وہ دیکھو چمن میں کلیاں چٹکنے کو بے چین ہیں اور اسی لمحہ دریا نے بہنے کے لئے انگڑائی لی۔ اسی طرح پوری کائنات متحرک اور فعال ہوگی۔

اقبال اسی فعالیت کے علمبردار ہیں۔ ان کی پوری شاعری، ان کا پیغام جگانے کا قائل ہے ۔اس لئے کہ قوموں کی زندگی میں جب ایسے مرحلے آتے ہیں تو پوری قومیں کچل جاتی ہیں اور اپنی تہذیبی شناخت اور پہچان کھو دیتی ہیں۔ اقبال یورپ کی سیاسی غلامی سے زیادہ متفکر و پریشان نہیں تھے لیکن انھیں سب سے زیادہ خطرہ تہذیبی غلامی سے تھا اور تہذیبی غلامی شروع ہوتی ہے زندگی کے بارے میں نظریات سے۔ اس لئے اقبال نے ''جواب خضر'' میں سب سے پہلے خضر کی زبان سے زندگی کا تعارف کرایا۔ نظم بہت طویل ہے اس لئے اس کے کچھ اشعار پیش کئے جا رہے ہیں تا کہ اقبال کا نظریۂ زندگی واضح ہو سکے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

دنیا کا ایک تصور یہ ہے کہ ہم اس میں ہیں اور زندہ رہیں گے حالات کے ہاتھ میں ہماری حیثیت ایک کھلونے کی مانند ہوتی ہے۔ جس طرف حالات چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زندگی کا حقیقی تصور رکھتے ہیں اور حالات کی کلائی مروڑ کر اپنے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آزاد نہ زندگی گزاریں اور کسی کے پابند نہ ہوں۔ جناب آدم کو جب اس دنیا میں بھیجا گیا تو یہاں آنے کے بعد انھوں نے خود اپنی دنیا کی تشکیل کی۔ اقبال نے زبور عجم میں ایک جگہ اس کی وضاحت کی ہے وہ کہتے ہیں:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدیم
بیاباں و کہسار و راغ آفیریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از دہر نوشینہ سازم

اقبال اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کو اگر نیابت الٰہیہ کے منصب پر فائز کیا گیا ہے تو اس میں جس کا وہ نائب ہے اس نے جو ہر تخلیق حاصل کیا بیشک یہ کائنات اس کی جوہر تخلیق کرتی ہے۔ انسان نے اس خارزار ہستی کو لالہ زار میں بدل دیا۔ یہ انسانی کاوشیں ایک طرف تسخیر کائنات کے تصور کو ابھارتی ہیں تو دوسری طرف یہ سمجھاتی ہیں کہ انسان مختار بھی ہے، فائل بھی ہے۔ اور قادر بھی (مطلق نہیں) اس طرح اقبال انسان کی سربلندی کا راگ چھیڑتے ہیں اور یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ قدیم نظریات جنھوں نے انسان کو مجبور محض اور مجہول بنا دیا تھا قناعت کا غلط تصور پیش کر کے یہ سمجھا دیا تھا کہ:

قسمت میں جو لکھا ہے وہ آئے گا آپ سے
پھیلایئے نہ ہاتھ نہ دامن پسارئیے

طالب حسین کہتے ہیں:

''اگر زندگی اس کا نام ہے کہ وہ عمر عزیز کے ساٹھ ستر سال یا اس سے کم و بیش مدت اچھے کھانے کھا کر اور باقی خواہشات پوری کر کے گزار جائے اور بس یہی مقصد حیات ہو تو اس طرح تو زندگی بے معنی لگتی ہے۔ یہ زندگی تو حیوانات کو بھی حاصل ہے جب انسان کبھی غور کرتا ہے، مراقبہ کرتا ہے تو اس کو ایسا لگتا ہے کہ زندگی مادی ضرورتوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اقبال کی طبیعت بچپن ہی سے صوفیانہ اور مفکرانہ تھی۔ اس لئے وہ انسانی

زندگی کو عناصر کے ظہور ترتیب سے آگے دیکھتے ہیں ۔ وہ زندگی کی روحانی حقیقت کے متلاشی تھے۔ ایک دفعہ اقبال نے عطیہ بیگم سے کہا: میری ذات میں دو شخصیتیں جمع ہیں۔ ظاہری شخصیت عملی اور کاروباری ہے اور باطنی شخصیت ایک فلسفی، صوفی اور خواب دیکھنے والے کی ہے۔''(۲)

وہ ایسے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں جو تسخیر کائنات پر قادر ہے۔ وہ زمان و مکاں کا پابند نہیں ہے۔ چنانچہ ساقی نامہ میں کہتے ہیں کہ فرنگی مدنیت اپنے ہاتھوں خود کو برباد کر رہی ہے ۔ اقبال نے بہت ہی مشہور روایتی علامت کا سہارا لیا ہے۔ یہ علامت شیشہ بازی کی ہے۔ شیشہ باز وہ ہوتا تھا جو سر پر شراب رکھ کر اس طرح رقص کرتا تھا کہ شراب کی ایک بوند نہیں گرنے پاتی تھی۔ وہ جسے چاہتا تھا پلاتا تھا اور جسے نہیں چاہتا تھا نہیں دیتا تھا۔ تو فرنگی سیاست کا راز اس طرح فاش ہوا کہ خود فرنگ حیرت زدہ ہے۔ وہ ساری کرتب بازی اور سیاست کی مکارانہ چالیں اب ناکام ہوگئیں:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

اقبال نے ان اشعار میں اپنے پورے عہد کی سیاست اور سماجیات کو سمیٹ لیا ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ یورپ میں انگریز کی وہ سیاست جو پہلی جنگ عظیم کے بعد انتداب کی پالیسی پر عمل پیرا تھی وہ شکست خردہ ہوگئی ۔ اور ممالک میں سیاسی آزادی کی تمنا اور تڑپ دوڑ گئی۔ اقبال اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایشیائی ممالک میں ایشیا کے سب سے بڑے ملک چین میں ڈاکٹر سن یات سین کو متانگ تحریک کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اپنے یہاں کے نظام پر تختہ الٹ کر عوامی حکومت قائم کی اس طرح وہ اپنے اشعار کے ذریعے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں بیداری کی ایک لہر اس طرح چل رہی ہے جس طرح یورپ میں نشاۃ الثانیہ تحریک نے پرانے تصورات، توہمات اور عقائد باطلا کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اقبال کی حکیمانہ نظر اس بیداری کی لہر کو دیکھ رہی ہے۔ اسے وہ ایک کلیہ یا فکری تصور کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

دل طور سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

اس طرح اقبال پیغام بھی دیتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلامیات کو دوسرے نظریات و افکار سے ملوث کر کے اسے بت کدے نظریات میں عجم کا پجاری بنا دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ عجم سے مراد ایران نہیں بلکہ عجم کا مطلب ہے ماسوا اسلام۔ اقبال کے تصورات کی تفہیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے دور کو بھی سمجھ لیا جائے۔ چنانچہ اقبال کے سیاسی و سماجی پس منظر کو سمجھنے کے لئے اس عہد کے تاریخی ماحول کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑی لیکن پہلی جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل ہی یورپ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ دوسری طرف انتداب یا ''لائڈ جارج'' کا نوآبادیات پر حکمرانی کا تصور آگے بڑھتا رہا۔ ایک ایک کر کے ممالک انگریزی اور فرانسیسی سامراجیت کا شکار ہوتے گئے۔ دوسری طرف یورپ صنعتی انقلاب کی وجہ سے اور بے روزگاری کی وجہ سے عریانی کا شکار ہوگیا۔ اور آدمی کے پاس جب کچھ کام کرنے کو نہیں ہوتا تو وہ خود فریبی کا شکار ہوتا ہے۔ اپنے غموں کو بھلانے کے لئے پھر ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے شراب، جس کے نشے میں تھوڑی ہی دیر کے لئے صحیح انسان کی عقل ناقص میں یہ بات آتی ہے کہ وہ اپنے سارے غم بھول بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے یہ شراب پینے کے نتیجے میں جب جیب میں پیسہ نہیں ہوگا تو فطری طور پر مفلسی اپنی رسی کس لے گی۔ اب اقبال سے صاف لفظوں میں سنئے:

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہے فرنگی مدنیت کے فتوحات

اقبال اس یورپ کے علم و ہنر کی روشنی سے اس لئے گریزاں تھے کہ یہ لوگ ایک طرف تو نہایت پرفریب مگر بلند بانگ دعوے کرتے تھے دوسری طرف بقول اقبال:

پیتے تھے لہو دیتے تھے تعلیم مساوات

یہی فرنگ کا شیشہ باز افریقہ اور ایشیا میں اپنے خونی پنجے گاڑ کر کمزور ملکوں کو غلام بنا رہا تھا۔ اس عالمی پس منظر کے ساتھ ہندوستان کے اس پس منظر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جو بیسویں صدی کے آغاز سے برطانوی سامراج کی پالیسی کا نمونہ تھا۔ ایک طرف وہ رجحان تھا جو کانگریس کی شکل میں سامنے آیا تھا ۔ کانگریس میں تلک نے آزادی کا نعرہ لگایا اور یہ کتنی بڑی ستم گری ہے کیونکہ مولانا حسرت موہانی نے تو تلک سے پہلے ہی ۱۹۰۷ء میں آزادئ کامل کا نصب العین پیش کیا تھا، ایک لہر یہ چلی۔ دوسری طرف سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو نے کاؤنسل میں داخلے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ آئینی مرعات حاصل کرنا چاہا۔ تیسری طرف ایک نئی آواز اٹھی تھی یہ ایک چادر پوش تھا جو جنوبی افریقہ سے ہندوستان آیا اور اس نے سوراجیہ

کے لئے عدم تشدد کے ذریعے ملک کو ایک نئی سمت دی۔ مہاتما گاندھی سے متاثر ہونے والوں میں نیا پڑھا لکھا ذہن پوری طرح آگے بڑھا۔ ایک لہر وہ تھی جو تشدد کے ذریعے انگریزی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی تھی۔ ان میں سردار بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو شامل تھے۔ ان لوگوں کو بعد میں پھانسی دی گئی، مگر اقبال جس وقت لکھ رہے تھے اس وقت بہرحال یہ زیریں لہر تھی۔

اقبال کے سامنے دراصل فکری سطح پر مغربی مفکرین کی فکر کو رد کرنا تھا تاکہ اسلام کی حقانیت کو درست ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف وہ فکری سطح پر بھی اسلام کی عظمت اور تاریخی سربلندی کا گیت گنگنا رہے تھے۔ مگر انہیں یہ بھی احساس تھا کہ غلامی میں کچھ کام نہیں آتا۔ نہ شمشیریں، نہ تدبیریں۔ بلکہ وہ تو اس حد تک آزادی کے پرستار تھے کہ ان کی نظر میں مومن کی اذاں اور تھی غلام کی اذاں اور۔ وہ اس آزادی کے پرستار تھے جو فکری طور پر، تہذیبی طور پر، معاشرتی طور پر انسانوں کو غلامی سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے فرزند جاوید کے نام جو نظم لکھی ہے اس میں یہ شعر ہی:

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

اقبال ہر مرحلے پر آزادیٔ افکار کے بھی قائل ہیں۔ آزادیت کے کردار کے بھی قائل ہیں مگر ان کے یہاں آزادی کے لئے مذہب کی حسین و خوبصورت زنجیر ناگزیر ہے۔ اقبال کسی وجہ سے مغرب کے نظام جمہوری کے خلاف ہیں کہتے ہیں:

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت ایک طرز حکموت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک جگہ اور کہتے ہیں:

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال اس جمہوریت کے قائل نہیں جو مغرب سے برآمد کی گئی ہے۔ دراصل جب وہ اپنے ان افکار کو پیش کر رہے تھے تو ہندوستان میں مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات ہندوستانیوں کو لبھانے کے لئے اور آزادی سے دور کرنے کے لئے نافذ کی جا رہی تھی۔ اقبال نے سیاسی دور بینی کے تحت ہندوستانیوں کو یہ سمجھایا تھا کہ دیکھنے میں یہ خوبصورت ہے، ایک سراب ہے، ایک فریب نظر ہے، ایک حسین دھوکہ ہے اس لئے اس کو قبول کرنا نادانی ہے۔ بیوقوفی ہے اور حماقت ہے۔ یہ دراصل ایک پنجرہ ہے جسے پرندے کو سمجھانے کے لئے آشیانہ بتایا جا رہا ہے۔ اس نظم کے پورے پس منظر میں بیسویں صدی کے ہندوستانیوں کی ابتدائی سیاسی تاریخ کے نشیب و فراز دستاویزی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اور یہی اقبال کا کمال فن ہے کہ وہ لمحاتی تصورات کو اور ان سے منسلک واقعات کو قید وقت سے آزاد کر دیتے ہیں۔

اس طرح اقبال کی زندگی انسانی جذبوں سے بھرپور تھی۔ خاندانی تربیت اور فطری شرافت کی وجہ سے ان کی سیرت سچائی، دیانت ہمدردی اور انسان دوستی سے عبارت تھی۔ خود اعتمادی اور عزت نفس اس درجہ تھی کہ برائیوں اور غیر پسندیدہ برتاؤ کے ساتھ کسی طرح بھی مصالحت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس قول پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ کوئی ہمارے گال پر طمانچہ مارے تو ہم دوسرا گال بھی اس کی طرف کر دیں۔ وہ برائی کا مقابلہ کرنے کے قائل تھے۔ اور یہ خصوصیات ان میں ابتدائی زندگی سے لے کر تادم آخر موجود رہیں۔ اقبال کا پورا کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو انسانوں اور ان کی زندگی سے کس قدر لگاؤ تھا۔ انسانی زندگی کا مطالعہ ان کی خصوصی دلچسپی تھی۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید یہ بتاتے ہیں ایک جرمن یا آسٹریلین سیاح اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے اپنی بیاض میں اقبال سے کچھ لکھنے کی درخواست کی، تو انھوں نے فارسی کا ایک قطعہ لکھ کر دستخط کر دیا۔ اس نے پوچھا:

آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا۔ میرے آباواجداد برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟'' (۳)

اقبال کا سرمایہ شعری انسانی عظمت کا نغمہ بھی ہے اور انسان کی تلاش و جستجو کا گیت بھی۔ اقبال کی شاعری کا ماحصل بھی انسان دوستی اور احترام آدمیت ہے۔ اسی زاویے سے فکر نے شعر کا روپ اختیار کیا ہے۔ پیش خدمت ہی:

طرز اقبال ہی میری گفتار ہے
حب اقبال میں دل گرفتار ہے
کیسے بھولے گی اقبال دنیا تجھے
ہر سخن ور کو تجھ سے بڑا پیار ہے
نقش ہے ذہن و افکار و ادباء میں تو
ایسا دلکش حسیں تیرا کردار ہے
لب کشا ہو تیری شان میں کیا حرا
ایک صدی تیری مدحت کو درکار ہے

حواشی

۱۔ عبدالواحد سید معینی: مقالات اقبال، ص ۷، آئینہ ادب، لاہور
۲۔ طالب حسین سیال: اقبال اور انسان دوستی، ص ۱۳۱
۳۔ عروج اقبال، ص ۹

❑❑❑

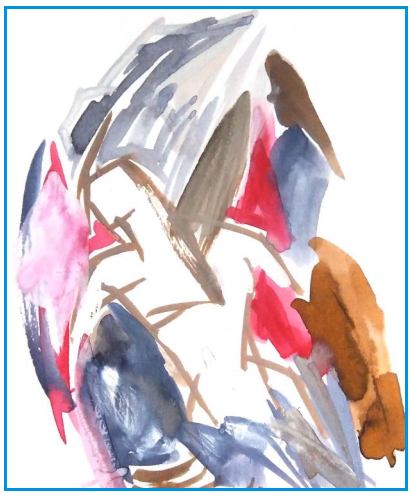

معین احسن جذبی: یادوں کے چراغ

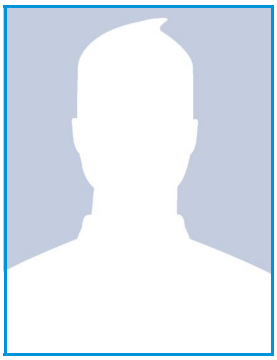

مظفر حسین سیّد

سربراہ اکیڈمک ریسرچ بیورو

29/11، سرسید روڈ، دریا گنج

نئی دہلی

رابطہ:

syedmh92@yahoo.com

جہان خوابیدہ کو بیدار کرنے والے شاعر معین احسن جذبی نے برسوں پہلے کہا تھا:

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگالوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچالوں تو چلوں
اور ایک جام مئے تلخ چڑھالوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں، ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جذبی موت وزیست کے شاعر تھے۔ پیام موت سے خوف زدہ نہ ہوکر فرشتۂ اجل سے مہلت مانگنے کی یہ ادا، یہ خواہش بے مثل ہے، جس کی نظیر اردو ادب تو کجا، شاید عالمی ادب میں بھی بہ مشکل ہی ملے گی۔ اس جرأت مندانہ اظہار تمنّا پر مبنی ان کی نظم 'موت' آزادی وطن کے چند ماہ بعد شائع ہوئی تھی، جب ایک نیا ہندوستان متشکّل ہو رہا تھا، بہ قول اقبال بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہو چکا تھا، اور آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم تمام کر چکا تھا۔ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، فانی کے شاگرد رشید تھے، گو ان کے یہاں مکتب میرؔ کے مزاج ورواج کے مطابق حزن وملال تو ہے، لیکن قنوطیت ومایوسی ہرگز نہیں، زندگی جینے کا حوصلہ ہے، موت سے پنجہ آزمائی کا عزم ہے۔ ان کے کلام میں رومانی جذبات واحساسات کے جلو میں انقلاب کی گونج ہے اور ان کا یہی وصف انہیں اپنے دور کے دیگر شعراء سے ممتاز وممیّز کرتا ہے۔

یہ چند سطور پیش بندی کے طور پر تحریر کی گئی ہیں، ورنہ زیر نظر مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے، تنقیدی ہرگز نہیں، نیز یہ جذباتی اظہار نامہ جذبی صاحب کے ساتھ راقم کے تعلق خاطر اور ان مراسم کی اساس پر سپرد خامہ کیا جا رہا ہے جو ایک استاد اور شاگرد کے باہمی روابط کے دائرے سے تجاوز کر کے اکثر وبیشتر بے تکلفی کی حدود میں داخل ہو جاتے تھے، گرچہ یہ حد فاصل دھوپ کی سرحد کے مانند تھی، جس کی جگہ مقرر نہیں تھی۔ ہماری جسارت اور ان کی عنایت کے طفیل اس خط منحنی کی حدود بدلتی رہتی تھیں، تاہم ایک محفوظ فاصلہ برقرار رہتا تھا، کہ حد ادب لازم تھی مگر ان باتوں کے باوصف ہمیں جذبی جیسی عظیم ہستی کی 'ہم قدمی' کا شرف حاصل تھا۔

ہمیں اپنی اوقات کا ادراک جب بھی تھا اور اب بھی ہے، نیز ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہم جذبی جیسی قد آور شخصیت کے نہ ہم نفس تھے، نہ ہم سفر اور نہ ہی ہم قلم تھے، ہماری کیا مجال کہ ہم کبھی تصور میں بھی ان

خیالات کو در آنے دیتے ،البتہ ہم ان کے ہم قدم تھے ،ان کے ساتھ چہل قدمی ،صدقدمی اور بیشتر الف قدمی کرنا ہمارے لئے باعث صد افتخار تھا۔ دراصل ہم قدم ہونا اور دوسروں کو ہم قدم بنانا جذبی صاحب کا محبوب مشغلہ تھا،اس ہم قدمی کی راہ میں عمر کا تفاوت کبھی آڑے نہیں آتا تھا بلکہ یہ موقع خردوں کو زیادہ نصیب ہوتا تھا ۔ہم سے قبل بھی کئی خردان کے اس کرم سے فیض یاب ہوئے ہوں گے اور ہمارے بعد بھی ،لیکن ہمیں یہ اعزاز حاصل تھا کہ اپنے قیام علی گڑھ کے دوران کئی برس پر محیط عرصہ ایسا گزرا، جب ہم ہر شام ان کے ہم قدم ہوتے تھے،نہ جذبی صاحب کو قرار تھا اور نہ ہمیں۔ جب تک ہم علی گڑھ میں رہے،اپنے اس تجربۂ نشاط میں ہم نے کسی اور کو شرکت کی اجازت شاذ و نادر ہی دی ، کیوں کہ جذبی صاحب کا اصول یہ بھی تھا کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی شخص کو اپنا ہم قدم بناتے تھے،اول تو وہ ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتے تھے، ناپسندیدہ اشخاص کو دور سے دیکھ کر ہی منہ بنا لیتے تھے، ناک بھوں چڑھا لیتے تھے، پھر کس کی ہمت ہوتی کہ قریب پھٹکتا۔اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی ہے جو دراصل قصّہ ہے کہ واقعے پر مبنی ہے۔

ایک صاحب جو جذبی صاحب کو سخت ناپسند تھے،انہیں شام کی سیر کے وقت اکثر مل جاتے ، بلکہ ان کا راستہ کاٹتے ، پھر ان کے قریب آ کر انتہائی فدویانہ مگر در اصل منافقانہ انداز میں پہلے فرشی سلام پیش کرتے ، پھر دریافت کرتے کہ ''حضرت آپ کا مزاج بہ خیر ہے' آپ کی بیگم کی طبیعت کیسی ہے اور آپ کے دیگر اہل خانہ کیسے ہیں'' ۔یہ تقریباً روز کا معمول تھا ۔ایک دن تنگ آ کر جذبی صاحب نے ان صاحب کے ایک درخت کی آڑ سے نمو دار ہوتے ہی انہیں اشارے سے روک دیا اور فرمایا ''دیکھئے ، میں بہ خیر ہوں، میری اہلیہ بخیر ہیں، میری تمام تر اولادیں خیریت سے ہیں اور میرا کتا بھی ٹھیک ہے۔اب کچھ اور پوچھنا ہے آپ کو؟'' یہ سننا تھا کہ وہ صاحب سلام عرض کرنا بھی بھول گئے اور ایک دوسرے درخت کی اوٹ میں پناہ لے لی۔اس دن کے بعد وہ بے چارے بجائے راستہ کاٹنے کے کنّی کاٹنے لگے، یوں یہ سلسلہ تمام ہوا۔

ہماری اور جذبی صاحب کی شام کی 'قدما قدمی' میں کبھی کوئی شریک نہ ہوتا تھا ،البتہ کچھ مستثنیات تھیں ،ہمارے دوست پروفیسر علی احمد فاطمی الہٰ آبادی ، جو اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان سے علی گڑھ کا تعارف ہم نے کرایا اور جذبی صاحب سے بھی ان کی پہلی ملاقات ہمارے ہی توسط سے ہوئی تھی ،وہ ان دنوں کبھی اپنی تحقیق کے سلسلے میں اور اکثر ہم سے یا چند اور احباب سے ملاقات کی غرض سے مہینے میں ایک آدھ بار ضرور علی گڑھ آتے تھے ،وہ بھی جذبی صاحب کے مداح تھے اور ان سے گفتگو کا موقع تلاش کرتے تھے ،لہٰذا جب ان کا ورود ہوتا تو ہم ان کے لئے سڑک خالی کر دیتے اور اس دن جذبی صاحب کی ہم قدمی کا شرف ان کے حصے میں آتا ۔ہماری علی گڑھ بدری کے بعد بھی فاطمی نے اس روایت کو زندہ رکھا ،مگر انہیں زیادہ مواقع نہیں ملے کہ پردیسی تھے۔

یہ جذبی صاحب کی ذرّہ نوازی ہی تھی کہ جب تک ہم علی گڑھ میں رہے ان کی ہم قدمی کا شرف اوّل ہمیں حاصل رہا ، جب ہم دانش گاہ سیّد کے منظر نامے سے غائب اور عازم دہلی ہوئے تو ہماری جانشینی ہمارے عزیز دوست مسعود مرزا نیازی نے سنبھالی ،انہوں نے بھی برسوں جذبی صاحب کی معیت میں شام کی سیر کی ،جذبی صاحب کے دور آخر تک وہ ان کے یہاں حاضر باش رہے۔مسعود اب بھی علی گڑھ میں مقیم ہیں، مگر افسوس کہ جذبی صاحب نہیں، وہ تو عالم بالا کی سیر کو جا چکے، ممکن ہے کہ وہاں بھی چہل قدمی ہی کر رہے ہوں۔

معین احسن جذبی اسم با مسمّٰی تھے ،وہ احباب و تلامذہ کے معین تھے ، بہر حال اور ہمہ وقت تھے۔ان کا کردار احسن تھا ،اعلیٰ تھا ،ارفع تھا اور وہ اپنے تخلص کی رعایت سے جاذب بھی تھے ،جذبی بھی تھے ،عملاً تھے ،یعنی سب کے ساتھ جذب ہو جاتے تھے ،اس طرح گھل مل جاتے کہ ہم جیسے خردوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے بڑے شاعر ہیں، فانی کے شاگرد رشید ہیں ، جوش کی بارگاہ میں باریاب رہے ہیں، فیض کے ہم عصر ہیں اور مجاز کے اتنے گہرے دوست کہ ایک جان دو قالب ۔سچ تو یہ ہے کہ ان کا قد اتنا بلند تھا کہا گر ہم ٹوپی لگائے ہوتے اور نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتے تو ٹوپی گر جاتی ، ہم لوگ ذرّہ تھے اور وہ آفتاب، ہم لوگ قطرۂ شبنم تھے اور وہ آسمان۔

جذبی صاحب سے ہماری پہلی شناسائی ان کے کلام کے توسط سے ہوئی،ان دنوں ہم درجہ ہفتم یا ہشتم کے طالب علم ہوں گے ،تاہم ہمارے مطالعے کی سرحدیں نصاب سے کئی برس آگے تک وسعت پذیر تھیں، جو ہاتھ لگتا اسے پڑھنے لگتے ۔شاید درجہ یازدہم کی کوئی نصابی کتاب تھی ،اس میں جذبی صاحب کی ایک غزل شامل تھی اور ان کا مختصر تعارف بھی مندرج تھا،غزل تو ہماری سمجھ میں کیا آئی ہوگی ،البتہ اچھی لگی ، کیوں کہ اشعار کی نغمگی اکثر زبان سے نامانوس افراد کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔حافظ و خسرو کے کلام پر وہ لوگ سر دھنتے ہیں جنہیں فارسی کی 'ف' نہیں آتی ۔خیر اس طرح ہم جذبی نام کے ایک شاعر سے واقف ہوئے ،جس کی تخلیق، میر، غالب، حالی، اقبال اور جوش کے ساتھ شریک نصاب تھی۔ہمارے لئے ان کی بلندی کی یہی پہچان کافی تھی ، پھر جیسے جیسے شعور آتا گیا حسرت، فانی اور جگر کے ساتھ ہم مجاز اور جذبی کی شعریات سے بھی لطف اندوز ہونے لگے۔اس پس منظر میں ہم علی گڑھ آئے اور مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں شعراء اور ادبا کا ایک پورا نگارخانہ ہمارے سامنے رقصاں تھا، رشید احمد صدیقی، معین احسن جذبی، قاضی عبدالستار اور شہریار، یہ چند بڑے فن کار تھے جو ہمیں چلتے پھرتے نظر آتے اور وہ سب ہم جیسے ادب کے مجنوں کے لئے اصنام سے کم نہ تھے۔سال دو سال بعد اس بزم میں بشیر بدر بھی شامل ہو گئے ،لیکن ہم انہیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے ۔اردو اور شعر و ادب سے عشق کے بروصف ہمارا

زیادہ وقت اپنے مضامین کی درس گاہوں کی بجائے شعبۂ اردو کے چکر کاٹنے میں گزرتا، جہاں کچھ دوست بن گئے تھے اور انوار کی چائے بھی ہمیں بہت مرغوب تھی ۔یہ ہماری کم نصیبی کہ ہم جذبی صاحب کے درسی شاگرد کبھی نہیں رہے،لیکن ہم نے ان سے استفادہ خوب کیا، بھرپور کیا۔

جذبی صاحب سے ہمارا اوّلین، باقاعدہ تعارف ہمارے بزرگ دوست جاوید کمال نے کرایا، جاوید کمال خود بہت اچھے شاعر تھے، جذبی صاحب ان کی شعر فہمی کے قائل تھے اور انہیں اپنی نئی غزل سناتے تھے، مگر زمانے نے ان کی قدر نہیں کی، شاید اس لئے کہ وہ کسی شعبۂ اردو میں استاد نہیں تھے۔خیر جاوید کمال صاحب کا ذکر پھر کبھی کہ تفصیل کا متقاضی ہے اور سردست قصّہ جذبی صاحب کا سنانا مقصود ہے۔ہم جاوید کمال صاحب کے ساتھ چائے کے شغل میں محو تھے کہ اچانک جذبی صاحب نے قدم رنجہ فرمایا، ہم نے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا اور ایک جانب سمٹ کر انہیں جگہ دی، اس عظیم شاعر سے ہماری یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، انہوں نے ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور جاوید کمال سے گفتگو کرتے رہے، پہلے گرد و پیش کے معاملات پر بات ہوتی رہی، پھر گفتگو کا رخ اچھی بری اور بڑی شاعری کی طرف مڑ گیا ۔ہمیں حیرت ہوئی کہ جذبی صاحب نے اپنی شاعری کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا، دنیا بھر کے سخنوروں کا ذکر کرتے رہے، خود بھی لطف لیتے رہے اور ہم لوگوں کو بھی محظوظ کرتے رہے۔

پھر ملاقاتیں معمول بن گئیں ۔وہ رطب اللسان رہتے، جاوید کمال موقع بہ موقع مصرعہ اٹھاتے اور ہم با ادب با ملاحظہ خاموش سامع بنے رہتے ۔شاید جذبی صاحب کو ہماری یہ وضع پسند آئی کہ ہم ان کی بات کان ڈال کر سنتے تھے، اسی لئے انہوں نے اپنی کم آمیزی کے باوجود ہمیں قریب آنے کا موقع دیا۔اس دوران ہم سے ایک حماقت ہوگئی، ہم نے جذبی صاحب سے کلام شاعر بہ زبان شاعر کی فرمائش کر ڈالی ۔ہماری توقع کے برعکس جذبی صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا، انہوں نے کمال ترشی سے فرمایا ''صاحب زادے، ہم اپنا کلام یوں نہیں سناتے، جو کچھ کہا ہے، دو مجموعوں کی شکل میں موجود ہے، کتب خانوں میں بھی اور کتب فروشوں کے یہاں بھی ،بس انہیں پڑھ لیجئے''۔ہم دم بخود تھے، کیوں کہ یہ ردعمل ہماری امیدوں نہیں، تصورات سے بھی پرے تھا ۔ہمارا واسطہ تو ایسے شاعروں سے پڑا تھا جو بطور رشوت چائے پلاتے تھے اور بلا فرمائش اپنا کلام سناتے تھے۔خیر صاحب !اس سے قبل کہ جذبی صاحب بکھرتے، جاوید کمال نے بات سنبھالی اور موضوع بدلتے ہوئے کہا ''رات ایک غزل سرزد ہوگئی ہے، میں اسے پیش کرتا ہوں''۔''جی ضرور'' جذبی صاحب نے سرد ہوتے ہوئے کہا کہ اور ہم نے اپنی جان کی خیر منائی ۔جاوید کمال کی غزل حسب معمول اچھی تھی ،اس لئے باتیں پھر گرما گرم ہوگئیں۔ بعد میں ہمیں جاوید کمال نے بتایا کہ جذبی صاحب اس طرح کی برملا فرمائشوں سے بہت چڑتے ہیں اور صرف بے تکلف دوستوں کو ہی اپنا کلام سناتے ہیں وہ تو مشاعروں میں بھی مارے باندھے ہی جاتے ہیں۔

اس واردات کے بعد آہستہ آہستہ جذبی صاحب نرم ہوئے ،ہماری نیاز مندانہ گفتگو اور ادب و شعر پر ہماری باادب تبصرہ آرائی سے بتدریج مانوس ہوتے گئے ،پھر نوبت یہ آئی کہ وہ ہمیں تنہائی میں بھی اپنے اشعار بے تکلف سنانے لگے اور ہمارا امتحان لینے کی غرض سے فرماتے ''کچھ سمجھ بھی رہے ہو کہ یونہی'' اور یہ سب تھا ہماری دل آسائی کی خاطر۔بہر کیف ہم مؤدبانہ عرض کرتے کہ ''آپ نے اس شعر میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے، فلاں معاملے کی طرف اشارہ کیا ہے فلاں رعایت رکھی ہے اور کئی قوافی میں ندرت ہے''۔''ہوں ۔سمجھتے ہو''۔جذبی صاحب جیسے خوش ہو کر کہتے ''اپنی تعریف پر نہیں، ہماری فہم پر''۔ہم عرض کرتے ''ہم نے آپ جیسے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے کچھ سیکھنے کی کوشش کی ہے ،یہ اسی کا فیض ہے ورنہ ''من آنم کہ من دانم''۔پھر جذبی صاحب کچھ مسرور کچھ مطمئن ہو جاتے ۔ان کے ذریعے ہماری فہم کا اعتراف ہمارے لئے کسی سند سے کم نہ تھا۔اکثر وہ اپنی نئی غزل بھی سناتے اور ہم جیسے کم مایہ کی رائے طلب کرتے ،ایک طالب علم کے لے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ایک دن پتہ نہیں کس خیال یا جذبے کے تحت انہوں نے ہم سے بلا تمہید ایک سوال کیا۔''تم شعر تو نہیں کہتے ہو؟۔ہم نے دست بستہ عرض کیا 'نہیں، بالکل نہیں'۔جذبی صاحب نے بڑے مطمئن لہجے میں فرمایا۔''اچھا کرتے ہو۔'' وہ بات تو وہیں ختم ہوگئی ،مگر ہم آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انہیں اس امر پر سکون تھا کہ ہم جیسا کم فہم، اُردو کے شعری سرمائے کو مزید پراگندہ کرنے باز رہا، یا ان کا اطمینان اردو کی شعری دنیا میں رواں دواں، کساد بازاری کے ذیل میں تھا، کہ ہم اس وبا سے محفوظ رہے۔

جذبی صاحب کا محبوب موضوع ذکر مجاز تھا، وہ مجاز کی باتیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ۔مجاز کے ایسے ایسے لطیفے سناتے جو کہیں شائع نہیں ہوئے تھے ،فرماتے کہ 'مجاز تو مجسم لطیفہ تھا، اس کا ہر جملہ، ہر فقرہ مزاح کا شاہکار تھا ۔وہ جب بات کرتا تو لطیفے برستے تھے ۔انہوں نے ہمیں مجاز کے بے شمار لطیفے ایسے سنائے، جو ہم نے پہلے کبھی نہ سنے تھے نہ پڑھے تھے ۔جذبی صاحب کہتے تھے کہ مجاز کے آدھے لطیفے بھی صفحۂ قرطاس پر نہیں آئے ہیں ۔وہ یہ بھی کہتے کہ ہمارے سنائے ان لطیفوں کو لکھ لو، محفوظ کر لو، ہمارے بعد انہیں سنانے والا کوئی نہیں ملے گا۔لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ جذبی صاحب کی یہ تمام تر قصہ گوئی سر راہ ہوتی تھی، چلتے پھرتے اور ٹہلتے ،وہاں نہ کاغذ ہوتا تھا، نہ قلم ،پھر لکھے کیسے جاتے ۔ہمیں حیرت ہے کہ اپنے زبردست حافظے کے باجود جذبی صاحب نے مجاز کے لطائف اور جملے بازی پر مبنی کوئی کتاب ترتیب نہیں دی ،شاید وہ اس سلسلے میں سنجیدہ نہ تھے۔

برسوں یہ معمول رہا کہ ہم شام کو سائیکل پر کہیں

جاتے ہوتے اور دوسری جانب سے جذبی صاحب اپنی چھڑی گھماتے خراماں خراماں آتے ہوئے نظر آتے ،ہم سائیکل سے کود کر سلام عرض کرتے اور ان کے ساتھ ہو لیتے ۔یہ ناطے شدہ ملاقاتیں کبھی شبلی روڈ کے نکڑ پر ہوتیں،کبھی باب فیض کے سامنے اور کبھی لال ڈگی کے موڑ پر۔ہم سائیکل کا ہینڈل تھامے ان کے ہم قدم بنے رہتے اوران کی پرلطف اور پرمغز گفتگو جاری رہتی۔منزل ہوتی تھی ریلوے کینٹین ،اکثر کھڑے کھڑے اور کبھی کبھار بیٹھ کر چائے پی جاتی ۔جذبی صاحب کی شریفانہ وضع داری یہ تھی کہ ملاقات چاہے سرراہ ہو،کسی موڑ پر یا کسی چائے خانے میں ،وہ ہمیں چائے پلائے بغیر رخصت نہیں کرتے تھے،ہم اگر سچ کہیں تو ان سے ملاقات کا ماحصل ادبی وعلمی استفادے کے علاوہ چائے کی ایک دو پیالیاں بھی ہوتی تھیں ،کیوں کہ طالب علمی کے اس دور میں مفت کی چائے بھی ایک نعمت سے کم نہ تھی۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ،جذبی صاحب شام کی سیر کے عادی تھے ،پیدل چلنے کے شوقین تھے،ان کے ساتھ ہماری ہم قدمی برسوں جاری رہی ،نہ ان کا دل بھرتا تھا اور نہ باتیں ختم ہوتی تھیں۔ہمیں یہ اعتراف ہے کہ ہم نے ان گشتی محفلوں میں جتنا کچھ حاصل کیا وہ بڑی بڑی ادبی نشستوں وعلمی مذاکروں پر بھاری تھا اور یہی ہماری ہم قدمی کا ماحصل تھا۔گورکی نے اپنی جدوجہد بھری زندگی کو اپنی دانش گاہ قرار دیا ہے اور ہماری درس گاہ ان دنوں یونیورسٹی سے ریلوے اسٹیشن تک جانے اور واپس آنے والی طویل شاہراہ تھی ،ہمارے فاضل مدرس جذبی صاحب تھے اور ہم ان کے شاگرد خوش بخت۔

جذبی صاحب کے علاوہ بھی ہم نے متعدد اساتذہ سے علمی استفادہ کیا ،جن میں قابل ذکر ہیں ہاشم قدوائی صاحب،سلامت اللہ خاں صاحب،اشتیاق عابدی صاحب اور اقبال حسن صاحب اور سرفہرست ہیں قاضی عبدالستار صاحب،جو ہمارے استاد گرامی ہیں ۔تاہم جذبی صاحب کا معاملہ ان سب سے مختلف نوعیت کا تھا جو اپنی جگہ یادگار ہے۔ایک عجیب وغریب بات تھی کہ جذبی صاحب مختلف شعراء کا ذکر تو کرتے تھے ،مجاز کے علاوہ جوش،فیض اور فراق کا،کبھی کبھار اپنے استاد فانی کو یاد کرتے اور کبھی اپنے محسن میکش اکبرآبادی کو بھی ۔مگر ان کی گفتگو کا موضوع شعری ادب بہت کم ہوتا تھا،انکے درس ہمیشہ افسانوی ادب کو محیط ہوتے تھے ،بالخصوص عالمی ادب ۔ان کے پسندیدہ فن کار ٹالسٹائے ،گورکی ،چیخوف اور موپساں تھے،انہوں نے ان تمام مشاہیر کی تخلیقات کو پڑھ نہیں رکھا تھا،پی رکھا تھا،وہ ان کے فن پر بڑی تفصیل سے ،بڑی گہرائی سے بات کرتے ،ان کی عظمت کا اعتراف کرتے اور اکثر فرماتے کہ یہ اردو ،ہندی والے کیا لکھیں گے ،مغربی فن کار پہلے ہی سب کچھ لکھ چکے اور انسانی حیات،کردار،مزاج اور فطرت کے ایسے ایسے پہلو اجاگر کر چکے کہ اب کچھ بچا نہیں ہے ۔البتہ وہ اردو میں داستانوں کے زبردست مداح تھے ،تمام تر داستانوں کا بالاستیعاب مطالعہ بارہا کر چکے تھے۔

ایک بار ہماری ملاقات کتب خانہ آزاد کے گوشۂ اردو میں ہوئی،ہم پتا نہیں کس فراق میں تھے،تبھی ہم نے دیکھا کہ جذبی صاحب داستانوں سے معمور ایک بڑی سی الماری سے نبرد آزما تھے ۔ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور دریافت کیا ''تم داستانیں پڑھتے ہو''۔ہم نے عرض کیا کہ فلاں فلاں پڑھ لی ہیں اور فلاں فلاں ابھی ارادے کی منزل میں ہیں ۔ہماری بات سن کر خوش ہوگئے اور فرمایا،داستان پڑھنا آسان نہیں ۔ایک تو زرد کاغذ اور پھر ضخامت بے پناہ ۔ایک ایک داستان کی سات سات بلکہ نو نو جلدیں ہیں،وہ بھی جہازی سائز میں ،پڑھتے پڑھتے چشمہ لگ جاتا ہے،عدسوں کا نمبر بدل جاتا ہے ۔مگر داستانیں پڑھنا ضروری ہے،اردو کا بیش قیمت اور اصلی سرمایہ انہی میں ہے''۔داستانیں دکھاتے دکھاتے ان کا رخ بدلا اور کلاسیکی شاعری کی طرف آگئے ۔انہوں نے ہمیں میر کی کلیات دکھائی ،جو کسی داستان کی طرح ضخیم تھی،پھر دیوان غالب سے گزرتے ،ذوق اور داغ کو مس کرتے اقبال تک پہنچ گئے ،اقبال سے آگے کسی خانے میں جوش کے ہمسایہ جذبی صاحب کے دونوں مجموعے رونق افروز تھے،ہم نے ادب سے اٹھائے اور منشا ظاہر کیا کہ آج انہیں مندرج کرا کر اپنے کمرے پر لے جائیں گے ۔''ارے ،یہ تمہارے پاس نہیں ،تم نے پڑھے تو ہیں''؟ہم نے جواباً عرض کیا کہ ہم نے پڑھے تو دونوں ہیں ،کسی استاد سے مستعار لے کر ،لیکن ہمارے پاس ہیں نہیں ۔بس پھر جذبی صاحب مہربان ہوگئے ،جوش کا ایک مجموعۂ کلام ہمیں اپنے نام پر درج کرا کر دیا اور بولے ''اپنے دونوں مجموعے ہم تمھیں دیں گے''۔دراصل اس وقت تک ان کے دو مجموعہ ہائے کلام 'فروزاں' اور 'سخن مختصر' ہی شائع ہوئے تھے ،'گداز شب' بہت بعد میں آیا اور 'کلیات جذبی' تو ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہوسکی۔

اس دن شام کو ہماری چاندی ہوگئی ۔ہم جذبی صاحب کے دولت کدے پر گئے تو پرتکلف چائے کے ساتھ انہوں نے اپنے دونوں مجموعے دستخط شدہ عنایت فرمائے ۔ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔پھر پوچھنے لگے کہ جوش کا کلام پڑھا؟ ہم نے کہا کہ بس ایک نظم پڑھ سکے ،پھر یہاں چلے آئے ۔''اچھا،مگر پورا پڑھنا،کہیں اٹکو تو مجھ سے پوچھ لینا۔جوش قدرے مشکل پسند تو ہے مگر زبان کا بادشاہ ہے،تراکیب اور تمثیلات اس کے ہاتھ کے کھلونے ہیں''۔دراصل جذبی صاحب جوش کے بڑے مداح تھے ،ہم نے مجاز کے بعد ان کی زبان سے سب سے زیادہ ذکر جوش کا ہی سنا۔وہ جوش کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے ،وہ اس بات سے بہت جزبز ہوتے تھے ،کہ فیض اور ان کے حواری جوش کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے تھے ،انہوں نے ہمیں بتایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے ترقی پسندوں کی کسی تقریب میں برسرمحفل کہہ دیا تھا کہ ''ہم سب ترقی پسند شاعر ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہوجائیں ،تب بھی ہمارا اجتماعی قد جوش کے انفرادی قد سے بلند نہیں ہوسکتا،ہم بونے ہی رہیں گے''۔

جذبی صاحب نے ہمارا حوصلہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہم اکثر شام کو ان کے دولت کدے پر بھی جا دھمکتے تھے، ان کی سیر کے وقت سے عین پہلے، وہاں چائے بھی ملتی اور وائے بھی۔ اور اس کے بعد ہم قدمی کا سلسلہ۔ جذبی صاحب کے فرزند ارجمند سہیل احسن ہمارے دوست تھے، وہ ان دنوں چپکے چپکے شاعری کرتے تھے، تاہم ان کی سخن آرائی کی اطلاع پوری یونیورسٹی کو تھی، ماسوا ان کے والد محترم جذبی صاحب کے۔ دل چسپ بات یہ کہ ہم جب بھی جذبی صاب سے ملنے جاتے تو سہیل کبھی ہماری محفل میں شریک نہیں ہوتے تھے، ان سے تو ہماری ملاقاتیں بازار شمشاد کے چائے خانوں میں ہوتی تھیں اور وہاں سنجیدگی کا رواج شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ جذبی صاحب سے ہماری ہم قدمانہ ملاقاتوں کے علاوہ دوسری نوعیت کی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں، ان کے دولت کدے کے علاوہ نجی محفلوں میں، کسی چائے خانے میں اور کتب خانوں میں۔ یہ ان کی قلندرانہ شان تھی کہ وہ ہماری خاطر کہیں بھی بیٹھ جاتے، چائے پیتے، بلکہ پلاتے، جگہ کیسی ہی غیر معیاری ہو، گفتگو ہمیشہ معیاری ہوتی تھی۔ اکثر ہم دیکھتے کہ ان کی قیام گاہ پر یا کہیں اور بھی کوئی نوجوان آتا، ان سے چند لمحے بات کرتا اور رخصت ہو جاتا۔ یہ ان کے ملاقاتی نہیں تھے بلکہ ان کے چہرے شاذ و نادر ہی نظر آتے تھے، ہم نے تفتیش کی تو انکشاف ہوا کہ یہ سب وہ غریب اور نادار طالب علم تھے جن کی مدد اور کفالت جذبی صاحب بڑی خاموشی اور راز داری سے کرتے تھے اور ہم نے اس مرد قلندر کی زبان سے اس ضمن میں کبھی اشارتاً بھی کچھ نہیں سنا۔ یہ علی گڑھ کی راویت تھی، اس کے استادوں کی شان تھی، لیکن اب یہ سب محض قصۂ پارینہ ہے۔

جذبی صاحب باضابطہ ادبی جلسے جلوس سے دور ہی رہتے تھے، حتّٰی کہ مخصوص نشستوں سے بھی حتی الامکان پہلو تہی کرتے تھے، ہم اپنے دور کے کامیاب محفل بازوں میں شمار تھے اور بڑے ماہر بزم آرا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی محفلوں میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے لیکن ہمارے ساتھ اپنی تمام تر محبت، الفت اور عنایت کے باوجود جذبی صاحب ہماری برپا کی ہوئی کسی شعری محفل میں جلوہ افروز نہیں ہوتے تھے۔ ہاں، ہم نے ایک مرتبہ انہیں اپنی اس عزلت نشینی کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا، اور یہ بھی ایک مثال تھی۔ یہ قصہ دور خسروی کا ہے۔ خسرو صاحب خوش خلقی، خوش لباسی، خوش خرامی اور خوش گفتاری میں اپنی مثال آپ تھے، ان کا ادبی ذوق خوب کڑھا ہوا اور شعری مذاق رچا ہوا تھا، بات بات پر شعر سناتے اور اچھے شعر پر سر دھنتے تھے، اس خاکسار کو یہ افتخار حاصل تھا کہ اس کے سنائے ہوئے کئی شعر وہ لکھوا کر جیب میں رکھ لیتے تھے اور اور بعد میں ان اشعار کو دیگر محفلوں میں برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کی شریک حیات طیبہ خسرو بھی ادب شناس اور ادیب و شاعر نواز تھیں، اسی ذیل میں ہم ان کے یہاں باریاب تھے اور انہیں طیبہ آپا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی رہائش گاہ یعنی وائس چانسلر لاج پر ایک باوقار شعری محفل منعقد کی، یونیورسٹی کے اہم شعراء اور چنیدہ اساتذہ کو مدعو کیا گیا، تقریباً تمام تر شعرائے عظام نے دعوت قبول فرمائی اور بمع کلام بلاغت نظام شرکت کا وعدہ کر لیا، مگر ایک مرد آزاد، یعنی جذبی نے شرکت کی حامی نہیں بھری اور طیبہ آپا کے فرستادہ قاصدوں کو ٹرخاتے رہے، جذبی صاحب علی گڑھ کے سب سے قد آور شاعر تھے اور ان کی شرکت کے بغیر کوئی بڑی شعری محفل وقار اور استناد حاصل نہیں کر سکتی تھی، اس لئے ان کی آمد ضروری تھی۔

اب یہ ہفت خواں سر کرنے کی ذمہ داری ہمارے سر ڈالی گئی، پورے معاشرے کو معلوم تھا کہ ہم جذبی صاحب کی بارگاہ میں باریاب بھی ہیں اور بے باک بھی۔ خیر ہم نے ڈرتے ڈرتے بیڑا اٹھایا اور حاضر ہو گئے ان کے در پر۔ جذبی صاحب حسب عادت مسکرائے اور ہماری استدعا سن کر فرمایا ''تم جانتے ہو میں عام طور پر مشاعروں میں نہیں جاتا اور سرکاری مشاعروں میں تو بالکل نہیں''۔ ہم نے کہا کہ طیبہ خسرو کا معاملہ مختلف ہے، وہ آپ کی مداح ہیں اور خسرو صاحب بھی ادب نواز ہیں، ہمارے خیال میں آپ کو کوفت نہیں ہوگی''۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری خاطر جذبی صاحب نے اپنا اصول توڑا اور اس بزم شعر و سخن میں شامل ہوئے۔ قاضی عبدالستار صاحب بھی شاعری سے اپنے تمام تر انقباض کے باوصف اس محفل میں تشریف لائے، سامع کی حیثیت سے۔ محفل کیا تھی، ایک ادبی کہکشاں تھی، کوئی بیس بائیس شاعر تھے۔ علی محمد خسرو صاحب میزبان خصوصی تھے اور آل احمد سرور صاحب صدر محفل۔ جذبی صاحب نے اپنی نئی غزل سنائی اور داد بھی بے حساب وصول کی۔ اگرچہ وہاں کئی جواں سال، ہر دل عزیز اور مقبول شعراء مثلاً بشیر بدر اور شہریار بھی موجود تھے۔ جذبی صاحب کے بعد صدر محترم کا نام پکارا گیا، نظامت غالباً نسیم قریشی مرحوم کر رہے تھے۔ سرور صاحب مائک پر آئے تو عقبی نشست سے کسی نے کہا کہ اب استاد کی باری ہے۔ تبھی قاضی صاحب نے برجستہ اور بہ آواز بلند کہا کہ ''استاد تو پڑھ چکے، اب مدرس کی باری ہے''۔ ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ جذبی صاحب کے ساتھ ہوئی تقدیم و تاخیر کی ناانصافی کی جانب تھا۔ خسرو صاحب نے ایک نگاہ درست انداز سے انکی جانب دیکھا اور سب کچھ سمجھ کر مسکرا دیئے۔

جذبی صاحب اگرچہ دکتور ادب تھے، مگر انہیں اس بات سے چڑ تھی کہ کوئی انہیں ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرے، کسی نے ڈاکٹر صاحب کہا اور وہ ناخوش ہوئے، پھر بڑا برا منہ بنا کر کہتے کہ ''ارے بھائی، نوکری کرنا تھی تو ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی بھی کر لی، اس میں کون سا کمال ہے اور اس کا ادب یا شاعری سے کیا تعلق ہے۔ جذبی صاحب کی بات درست تھی، جوش تو بہ مشکل آٹھویں جماعت پاس تھے اور ایم اے کے نصاب میں ہیں اور ان پر تحقیقی مقالے مسلسل لکھے جاتے ہیں۔

جذبی صاحب کے دو جملے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اکثر ہم جیسے نو واردان ادب کو تلقین کرتے

کہ ''ادب کا تا اور لے دوڑی کا نام نہیں، اپنی تخلیق مکمل کرکے تکیے کے نیچے چھپا دو اور دنوں بعد نکال کر پڑھو ،تب فیصلہ کرو''۔صراحتاً وہ مزید کہتے کہ ''روم بھی ایک دن میں نہیں بنا تھا، برسوں لگے تھے۔''

ایک بار انہوں نے ایک دل چسپ واقعہ سنایا کہا یک نوجوان شاعر، جنہیں جدیدیت بلکہ تجریدیت کا خبط تھا، ایک دن اپنا مجموعۂ کلام لے کر ان کے پاس آئے اور ملاحظہ ومطالعہ کے بعد رائے زنی کی استدعا کی ۔جذبی صاحب نے ان کی کتاب کا عنوان دیکھا ،اس کے اوراق پلٹے اور پوچھا کہ بھئی اس عنوان کے معنی تو بتایئے۔ان صاحب نے سینہ تان کر کہا کہ ریگستان کی ایک ایسی جھاڑی جسے اونٹ بھی نہیں کھاتا ۔اس پر جذبی صاب نے برجستہ فرمایا کہ میاں آپ نے ہمیں اونٹ سے بھی گیا گزرا سمجھا ہے؟ستم ظریفی یہ کہ بعد میں ان ناشاعر کا بڑا غلغلہ ہوا، ان پر انعامات واکرامات کی بارش ہوئی ،انہیں وہ اعلیٰ سرکاری انعام بھی ملا جو غریب جذبی کو بھی نصیب نہیں ہوا ،مگر آج محض چند برس بعد کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا اور جذبی آج عشروں بعد بھی جذبی ہیں، ہمیشہ رہیں گے۔

جذبی صاحب کو اردو دنیا کے بیشتر انعامات واعزازات ملے، ماسوا ایک دوسرکاری انعامات کے۔ ایک مرتبہ انہیں مرکزی حکومت کی جانب سے پدم شری کی پیش کش ہوئی تو انہوں نے سرکاری قاصد سے پوچھا کہ اس اعزاز یا خطاب کے ساتھ پیسے کتنے ملیں گے، جب جواب نفی میں ملا تو انہوں نے وہ اعزاز قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔اسے جذبی کی طلب ثروت پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ پورے نظام پر ایک برجستہ طنز سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔

اپنی تمام تر شان استغنا کے باوجود ایک زمانے میں جذبی صاحب پر مکان کی تعمیر کا شوق سوار ہوا، شاید بیگم صاحبہ کے مسلسل اصرار پر۔ان دنوں چہل قدمی اور ٹہل قدمی سب موقوف ہوگئی اور جذبی صاحب اپنے دوست، شاعر میکشؔ بدایونی کی قیادت میں صرف مکان سازی اور عمارتی ساز و سامان کی فراہمی میں مصروف رہنے لگے۔جذبی صاحب اس میدان میں نووارد بلکہ نوسیکھیے تھے اور میکشؔ صاحب اس فن کے ماہر، کیوں کہ وہ ایک بنگلہ نما مکان کے مکین تھے اور اُس کے اردگرد ان کے کئی مکان کرائے داروں کا مسکن تھے، حتیٰ کہ شاگرد پیشے بھی ذریعۂ آمدن بن گئے تھے۔ہم اکثر جذبی صاحب کو میکشؔ صاحب کے ساتھ کبھی جالی ،کبھی کھڑکی جیسی غیر شاعرانہ اشیاء کے ساتھ متوحش انداز میں رکشے میں لدے پھندے اور ساز وسامان کے بیچ پھنسے دیکھتے اور دل ہی دل میں کڑھتے کہ اچھے بھلے شریف انسان اور شاعر اعظم کو یہ کیا دھن سوار ہوئی کہ اپنا محبوب مشغلہ شام کی سیر بھی قربان کیے، ڈھویا ڈھائی میں مصروف ہیں۔وہ شاید منٹوؔ کے اس قول سے متفق نہیں تھے کہ بے قوف مکان بناتے ہیں اور عقل مند اس میں رہتے ہیں۔خیر جذبی صاحب کا مکان بنا اور خوب شاندار بنا، سکبدوشی کے بعد وہ اس میں منتقل ہوگئے تھے اور آج وہ ان کے ورثا کے تصرف میں ہے۔

غلط بخشی ہمارے ملک اور معاشرے کا طرۂ امتیاز ہے اور علی گڑھ اس کا ایک اہم مرکز۔جذبی صاحب اپنی تمام تر شاعرانہ عظمت، شہرت ومقبولیت کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر نہ ہوسکے۔ہر چند کہ اس وقت تک پروفیسری کی وہ درگت اور خواری نہیں ہوئی تھی جو آج ہے اور نہ ہی یہ منصب اتنا ارزاں ہوا تھا، جیسا کہ اب ہے، مگر اتنا گراں بھی نہ تھا کہ جذبی جیسے عالم، فاضل اور لائق استاد کی دستار کا سرخابی پر نہ بن سکتا۔لیکن جذبی صاحب کو نہ صرف مسترد کیا گیا بلکہ جن صاحب کو یہ منصب تفویض ہوا وہ جذبی کے ہم پلّہ تو کیا ان کا پاسنگ بھی نہ تھے، ان کی شاعری تو خیر برسبیل تذکرہ تھی اور ان کی لیاقت وشہرت کا دارومدار محض ایک مضمون پر تھا، جو انہوں نے اوائل عمری میں لکھا تھا اور پھر وہیں مقیّد مقام ہوگئے تھے، آگے نہ بڑھ سکے تھے۔مگر وہ نہ صرف پروفیسری پر قابض ہوئے بلکہ کرسی صدارت شعبہ پر بھی براجمان ہوئے۔جذبی صاحب نے اس کے بعد جیسے تیسے اپنا وقت پورا کیا اور کبھی اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی شکل نہیں دیکھی۔خسروصاحب جو اس وقت تک جذبی کے مداح ہوچکے تھے، انہوں نے اس حق تلفی کا ازالہ ان کی خدمات کو توسیع دے کر کیا اور یہ سب کچھ بلاشرط اور آزادنہج پر تھا۔

جذبی صاحب عام طور پر اساتذہ کے علاوہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے ہم عصروں کو تو قطعاً نہیں۔غالبؔ اور اقبالؔ کے احترام کے باوصف ان کا پسندیدہ شاعر کون تھا ،مولانا الطاف حسین حالیؔ۔وہ اکثر ان کا ایک شعر زیر لب گنگنایا کرتے تھے:

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

یہ شعر غالباً ان کے جذبۂ محرومی کی ترجمانی بھی کرتا تھا ممکن ہے کہ انہیں یہ احساس رہا ہو کہ انہیں ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ سزاوار تھے ،بہرکیف نقادوں نے انہیں ان کا جائز مقام دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن ان کی شاعری ان کی لازوال شہرت کی ضامن ہے، وہ اکثر کہتے بھی تھے کہ ''میری شاعری کے پاؤں ہیں، جن سے وہ چلتی ہے اور چلے گی، اسے کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں''۔بیسویں صدی کی شعری راویت جن چند نامور ان سخن سے عبارت ہے ان میں ایک روشن اور تابناک نام معین احسن جذبی کا ہے۔وہ ترقی پسند بھی ہیں، رومانیت پرست بھی، مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھے اور بڑے شاعر ہیں، ان کے چند شعر بہتوں کے کے دواوین پر بھاری ہیں اور یہی وصف انہیں جاوید بناتا ہے۔

❑❑❑

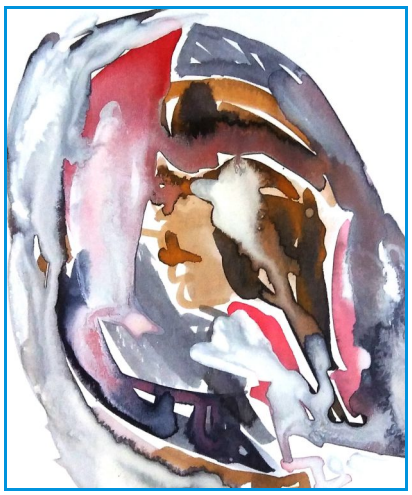

نیّر سلطانپوری کی ہمہ جہت شخصیت

عالم ندوی

ایم این ڈسوزا کمپاؤنڈ

روم نمبر ایچ/ ۵، ساکی ناکا

ممبئی

رابطہ: 9594678676

عموماً پیدائشی طور پر کوئی بھی انسان کسی قدر و منزلت کا حامل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات اپنے اندر قطعی جواز رکھتی ہے کہ اس کائنات میں پیدا ہونے والا ہر انسان فطری طور سے مجبور ہوتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی میں تدریجی طور سے بہت سے بدلاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ وہ بہت سے خارجی و باطنی خوبیاں کا ادراک و انکشاف کرتا ہے۔ تب کہیں جا کر علم و کمال کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں بعض شخص ایسے بھی ہوتے ہیں، جو خدا کی طرف سے خاص صلاحتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں، اور وہی صلاحتیں ان کی شناخت کا اصل ذریعہ بنتی ہیں، اُس کی وہی وجبی صلاحیتیں اسے دوسروں سے منفرد کرتی ہیں۔ جس کی بنیاد پر اس کے مرتبہ و منصب کا تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انسان کی ذاتی محنت و لگن کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ بغیر محنت و مشقت کے کوئی انسان اس منزل کو نہیں حاصل کر سکتا ہے، جسے قدرت نے اس کے لئے مقدر کر رکھا ہے۔ جن کے اندر کچھ کر گذرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں تو وہ مرنے کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

یہ بات دوسری ہے کہ کچھ لوگوں کا مقام ان کی زندگی ہی میں متعین ہو جاتا ہے۔ اور کچھ کا ان کی زندگی کے بعد غالب کو عمر بھر یہی شکایت رہی کہ زمانے نے ان کی قدر و منزلت کو پہچاننے میں بخالت سے کام لیا ہے۔ مگر ان کے بعد سے آج تک ان کے کلام پر بحث و تحقیق کا جو سلسلہ چل رہا ہے اور اس وقت وہ شہرت و عظمت کے جس مقام پر جلوہ گر ہیں وہ مقام شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہو۔

یہی حال نیّر سلطان پوری کی شاعری کا بھی ہے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی میں گمنامی سے باہر نہ آسکی اور انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کی تمنا وہ عمر بھر کرتے رہے مگر آج جب کہ وہ دنیا میں نہیں رہے تو جگہ جگہ ان کی عظمت کے چرچے سنائی دیتے ہیں اور ادیبوں و شاعروں کی محفلوں میں ان کا مقام متعین کیا جاتا ہے۔ نیر صاحب کو بھی شاید اس کا احساس تھا کہ لوگوں کو میری ضرورت اس وقت محسوس ہوگی جب میں کسی لائق نہ رہوں گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

نیر میں جب کہ خوگر راحت نہیں رہا
مجھ کو تلاش کرتی ہے منزل جگہ جگہ

شمع بجھنے لگی اور رات کی بھیگی آنکھیں
خیر جھونکا ہی ہوا کا ادھر آیا تو سہی

.....

اب زندگی کو کاوش بے جا میں لطف ہے
مجھ کو بھی چن لیا ہے کسی دیدہ ور نے کیا؟

.....

زندگی آج بھی ہے تشنۂ تعبیر ہنوز
چشم بیدار نے کیا خواب پریشاں بخشا

نیر صاحب کہتے ہیں کہ میری خودداریاں میرے تمام امور میں حائل رہیں ورنہ مجھے کون نہیں جانتا۔

میری خودداری کے آگے ان کی نظریں جھک گئیں
جب مجھے دیکھا تو صورت آشنا کہنا پڑا

قبل اس کے کہ نیر صاحب سلطان پوری کی شاعری کا جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے مختصر حالات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

آپ کا اصل نام سید توکل حسین ہے اور نیر تخلص۔ آپ کا تعلق ایک شریف اور علمی گھرانے سے تھا۔ آپ ۱۹۰۸ء میں قصبہ ایسولی تحصیل مسافر خانہ ضلع سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدا دینیات کی تعلیم والدین کی نگرانی میں گھر پر ہی ہوئی۔ اور گھر ہی پر پرائمری کے ایک اسکول میں داخلہ لیا پرائمری کی تعلیم کے بعد کالج کا رخ کیا۔ اور شہر سلطانپور کے گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے انٹر پاس کیا۔ پھر یہاں سے فیض آباد تشریف لے گئے اور وہاں گورنمنٹ کالج فیض آباد سے بی اے کیا ایم اے کرنے کے تھوڑے دن بعد جی آئی سی کالج میں بحیثیت استاد تقرر ہوئے۔ لیکن لکھنؤ سے ادبی مراسم استوار رکھا۔ وہیں سے ٹیچر کی ٹریننگ بھی کی، بعد میں مدھوسودن ودیالیہ انٹر کالج میں اردو کے لیکچرر ہو گئے۔ ملازمت کے دوران سیاسیات میں ایم اے اور اردو سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ نیر صاحب اپنے اساتذہ میں انگلش کی ٹیچر بابو شمبھو پرشاد صاحب، بابو جدوراج بلی عیش اور عربی کے مدرس مولانا مظفر حسین صاحب سے متاثر تھے اور یہ تاثر محض ان لوگوں کی علمی قابلیت کی بنیاد پر تھا۔ نیر صاحب کی شاعری ان کے فطری ذوق کا نتیجہ تھی، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی اور جدت اسلوب میں کسی کے وصال و فراق کا کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ سترہ، اٹھارہ برس کی عمر سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز نظموں سے ہوا کیوں کہ وہ جوش ملیح آبادی کا زمانہ تھا اور لوگ ان کی نظموں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس بات کی تائید خود نیر صاحب کے اس قول سے ہوتی ہے۔

''اصل بات یہ ہے کہ شعر و شاعری تو خدا داد چیز ہے جس کو خدا نے نواز دیا وہی اس دولت سے مالا مال ہو گیا۔ یہی حال ہر علم اور زندگی ہر خوبی کا ہے، لوگوں کو میری کمسنی پر بڑی حیرت ہوتی تھی اور چونکہ اس زمانے میں جوش ملیح آبادی کا دور تھا نظموں کا زمانہ تھا اس لئے میری شاعری کا آغاز نظموں سے ہوا۔''

شاعری میں نہ تو ان کا کوئی استاد تھا اور نہ ہی کسی کے سامنے انہوں نے زانوے ادب تہہ کیا بلکہ وہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء کے پاس جا کر اپنا کلام سناتے اور وہ ان کے اچھے شعروں کی تعریف کر کے ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں نیر صاحب کہتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ عربی فارسی کی تعلیم نے شعر و سخن میں کچھ ایسی دلچسپی پیدا کر دی کہ کلام میں اصلاح لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور نہ ہی اساتذہ نے میرے کلام کو سننے کے بعد اصلاح فرمائی جس سے میرے یقین میں اور پختگی پیدا ہو گئی اور اصلاح کی زحمت ہی کسی کو نہ دی۔ میرے دور کے اساتذہ میں تو بہت سے حضرات تھے۔ لیکن میں اپنے کلام کو علامہ صفی لکھنوی اور آرزو لکھنوی کو اکثر سنایا کرتا تھا۔ اس خیال کا اظہار راقم السطور سے دوران انٹرویو خود کیا تھا۔ کہ ذہن میں یہ بات نہ پیدا ہو کہ میں سلطان پور سے لکھنؤ جا کر اپنے کلام کو انہیں سناتا تھا بلکہ میں اس زمانے میں لکھنؤ ہی میں مقیم تھا اس کے علاوہ آرزو لکھنوی کے یہاں ہر ماہ ایک نشست ہوا کرتی تھی اس میں بھی کلام سنانے کا موقع ملتا تھا۔''

نیر سلطانپوری اپنے زمانے کے مشہور شعرا میں علامہ صفی لکھنوی سے بہت زیادہ متاثر تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے علامہ صفی لکھنوی کا تتبع نہیں کیا کیونکہ وہ شاعری میں انفرادیت کے قائل تھے اور اس انفرادیت کو اپنی شاعری میں بڑی حد تک نبھانے کی کوشش بھی کی بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آئی غنچوں میں کہاں سے یہ ادائے دلبری
اس چمن سے کون گزرا تھا حسیں پہلے پہل

مدتیں گزری ہیں دل کو آئینہ خانہ بنے
کون جانے کون تھا اس میں مکیں پہلے پہل

وہ گھنی پلکیں جو بوجھل تھیں وقار حسن سے
میری چشم شوق سے ملکر جھکیں پہلے پہل

.....

جب کر چکا کرم تیری رحمت سے ساز باز
تب جا کے آشنا ہوئے تر دامنی سے ہم

اے یاد دوست منزل وہم و گماں سے دور
پہنچے کہاں کہاں نہ تری رہبری سے ہم

.....

محفوظ کر رہا ہوں میں آثار میکدہ
ٹوٹے پڑے ہیں ساغر و مینا کہیں کہیں

سجدوں کا احترام کر اے اضطراب شوق
اپنا ہی نقش پا نہ ہو زیر جبیں کہیں

ہر طرف جھونکے ہوا کے کیف برساتے چلیں
تم اگر کہہ دو تو بادل سر پہ منڈلاتے چلیں

نامکمل کیوں رہے آرائش حسن نظر
ہم لگے ہاتھوں ترے گیسو بھی سلجھاتے چلیں
آ کے پلکوں پر گرے تو قدر و قیمت بڑھ گئی
قطرہ قطرہ آنسوؤں کا تھا گہر اپنی جگہ

نیّر صاحب صنف شاعری میں زیادہ تر قصائد، غزلیں، قطعات، نظمیات میں ہی طبع آزمائی کی ہے۔ نظموں میں زیادہ تر انہوں نے اصلاحی نظمیں لکھی ہیں جس کے ذریعہ قوم میں بیداری کی جوت جگانے کی ایک کامیاب کوشش کی لہٰذا ان کی نظمیں براہ راست قوم کے لئے ایک پیغام کی صورت رکھتی ہیں۔ چونکہ وہ ایک ہوشمند استاذ تھے اس لئے انہوں نے کالج کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔

اپنی ایک نظم ''یونیورسٹی آف گارڈ'' یعنی درسگاہ الٰہیہ میں کالج کے پورے نظام کو اسلام کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں نئے اصطلاحات وتلمیحات واستعارات کا استعمال بڑی فنی چابک دستی سے کیا ہے اور عنوان کے پیش نظر جو انداز بیان اپنایا ہے اپنی مثال آپ ہے وہ خود لکھتے ہیں۔

'اردو میں ایسی نظم ابھی نہیں لکھی گئی، میں اس راہ کا پہلا مسافر ہوں۔' چند اشعار ملاحظہ ہوں:

درسگاہ دین کیا ہے یہ سنیں اہل نظر
ہے ازل سے یہ ادارہ دو جہاں میں معتبر
درسگاہ دیں فری ہے ابن آدم کے لئے
درسگاہ دیں کا نیر خود خدا ہے چانسلر
کہتے ہیں اسلام جس کو وہ ہے تعلیمی نصاب
اس نصاب حق نما سے ہے زمانہ باخبر
منصبوں کا ہے تقرر خود خدا کے ہاتھ میں
اس میں رائے عامہ کا ہو نہیں سکتا گزر
ناظم اعلیٰ ادارے کے محمد مصطفیٰ
جنکو بھیجا ہے خدا نے کرکے وائس چانسلر

آگے چل کر کہتے ہیں:

ایک لاکھ چوبیس ہزار اس میں معلم آچکے
کر چکا اسلام سب کو علم دیں سے باخبر
کہتے ہیں قرآن جس کو وہ ہے سرکاری گزٹ
اس گزٹ میں درج ہیں سرکار کے سب سرکلر
درسگاہ ایزدی کے امتحاں ہیں پریکٹیکل
زندگی تعلیم ہے اور امتحان ہے عمر بھر

اس کے بعد لکھتے ہیں:

پاس ہونے کے لئے لازم ہے کچھ حسن عمل
اور سفارش بھی اسی صورت میں ہوگی کارگر
ممتحن چاہے بھلا کرنا تو نمبر دے کہاں
کاپیاں سادی ہی ہم نے چھوڑ رکھی ہیں اگر
نامۂ اعمال کی کاپی پہ لکھواتے رہیں
قبل ازیں نگراں ملک کہہ دیں کہ ٹائم از اوور

خیالات کی جدت اور سادگی بیان کے ساتھ ساتھ نظم میں انگریزی الفاظ اس حسن وخوبی سے پروئے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ انہیں مواقع کے لئے ڈھالے گئے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ اشعار میں آپ نے دیکھا بھی۔ نگینہ سازی کا یہ عمل سب کے بس کی بات نہیں وہ نیر صاحب ہی کا قلم ہے جو بے جھجک لکھ جاتا ہے اور ذہن پر کسی قسم کا بار بھی محسوس نہیں ہوتا ہے:

زندگی اور موت کے عنوان سے ایک ایسی اچھوتی نظم انہوں نے لکھی ہے اور اس میں جس انداز سے انگریزی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ آج تک اردو شعراء میں کسی اور کو اس کی توفیق نہ ہوسکی طرز بیان سادہ ہے اور الفاظ بھی ہلکے پھلکے ہیں۔ مگر زندگی، موت، قبر، جزا وسزا کا فلسفہ چند الفاظ میں بیان کرکے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ جس کو عرف عام میں کہتے ہیں زندگی
وہ ہے عدم سے ہستی میں آنے کا پاسپورٹ
ویزا ہے کتنے دن کا کوئی جانتا نہیں
یہ موت کے فرشتے کی ہے ڈائری میں نوٹ
وہ جس کو عرف عام میں سب موت کہتے ہیں
ویزے کے ختم ہونے کی ہے فائنل رپورٹ
کہتے ہیں جس کو قبر وہ ہے سرحد عدم
اس بارڈر پر ہوتا ہے چیک سب کا پاسپورٹ
منکر نکیر کرکے عقائد پر کچھ سوال
اذن سفر پر اپنا لگاتے ہیں ایک نوٹ
اچھوں کو علیین بدوں کو ہے سجین
ملک عدم کے دونوں ہیں یہ شاندار فورٹ
وہ جس کو عرف عام میں اعمال کہتے ہیں
حکم خدا پہ چلنے نہ چلنے کی ہے رپورٹ

منظر نگاری بھی ان کی شاعری کا اہم جز ہے۔ جس میں موقع بہ موقع نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''رقاصہ'' منظر نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایک رقاصہ اپنی مکمل سج دھج کے ساتھ ناچنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا منظر اس نظم میں اس طرح کھینچتے ہیں:

آنکھیں ہیں کہ بھونرے کا کنول میں ہے بسیرا
زلفیں ہیں کہ ساون کا گھٹا ٹوپ اندھیرا
غازے نے تیرے رخ پہ عجب رنگ بکھیرا
یخ بستہ پہاڑوں پہ ہوا جیسے سویرا
محفل میں پری اڑنے کو تیار کھڑی ہے
رقاصۂ افلاک سے آنکھ اس کی لڑی ہے
پوشاک جھلا جھل ہے چما چم تیرا آنچل
شاخ گل تر ہے لچک جانے کو بے کل
ہیں آہوئے صحرا کی طرح سب تیرے چھل بل
وہ ساز بجا اور وہ بجنے لگی چھاگل
عشاق کے دل پاؤں تلے روند رہی ہے
بجلی سی سر بزم حسیں کوند رہی ہے

انہوں نے شاعری کی دیگر اصناف سخن میں خوب خوب طبع آزمائی فرمائی ہے، اور بہترین مضامین کو اپنے پیرایہ اظہار میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو ان کی استادانہ صلاحیتوں پر ایک واضح دلیل رکھتی

ہے۔انہوں نے بہت سے قطعات بھی کہے ہیں،جن میں بلندی فکر کی جلوہ گری کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

جو نہ دور ہوں قفس سے نہ قریب آشیاں سے
وہ ڈریں گے کیا عنادل کبھی جور آسماں سے
وہ جنوں دیا ہے جس نے مرے دل کو تابش غم
وہی توڑ لایا تارے بھی فراز آسماں سے

انھوں نے اردو اور ہندی زبان کو لے کر اٹھنے والے ،لسانی تعصابات کے پیش نظر، بڑی اچھی بات اپنے اشعار کے ذریعہ کہی ہے۔اسے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ہندی اردو دونوں بہنیں اسی نگر میں رہتی ہیں
اپنی اپنی جیون گھٹنا ہم سے تم سے کہتی ہیں
ایک لئے ہے ساہتیہ درپن اک ادب کا آئینہ
ہندی اردو دونوں جیسے گنگا جمنا بہتی ہیں

آگے چل کر کہتے ہیں:

اردو پریمی جنتا کی یہ یاد رکھو تم دل کی بات
اردو گرانیواری نہ ہوگی شاشن کا گن گان نہ ہوگا

مذکورہ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ نیر صاحب کی شاعری کی ابتدا نظموں سے ہوئی ۔غزل کی طرف رجحان بہت بعد میں ہوا مگر جب غزل کے میدان میں قدم رکھا تو اس کا بھی حق ادا کر دیا۔اس سلسلہ میں نیر صاحب کہتے ہیں:

''غزل کی طرف رجحان ہونے میں واقعہ یہ ہے کہ میرا قیام تو لکھنؤ میں ہی تھا اور آرزو لکھنوی کے یہاں ہر ماہ غزلیات کی طرحی نشست ہوا کرتی تھی ۔اس لئے مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی اس میں حصہ لوں۔اس طرح میں نے صنف غزل میں بھی طبع ازمائی شروع کر دی۔ورنہ پہلے میں نظم ہی لکھا کرتا تھا۔''

ان کی غزلیں نیرنگی خیالات اور حسن بیان کے گلہائے رنگا رنگ سے معمور ہیں چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں:

کیا بتائیں بے خودی میں ہم کو کیا کہنا پڑا
جام کو تقدیر ساقی کو خدا کہنا پڑا
ایک عجب دنیا تھی وہ آداب میخانہ نہ پوچھ
احتراماً رند کو بھی پارسا کہنا پڑا
اک فسانہ بن گئی ساری حدیث احتیاط
وہ مقام آیا کہ ہر بت کو خدا کہنا پڑا

.....

پہنچا نہ تھا یقین کی منزل پہ میں ابھی
میرا خیال مجھ سے بھی آگے نکل گیا
ہے چشم التفات کو فکر شکست دل
شاید حریف کوئی نئی چال چل گیا

.....

نہ جانے کیا خطا کی تھی جبین ابن آدم نے
ابھی تک در بدر رسوا ہے ذوق بندگی تنہا

.....

جب تشنہ لبی اپنی تقدیر کی قائل ہے
احسان کرم تجھ پر فرمانے سے کیا حاصل
کیا کچھ نہ ہوا ہوگا گلشن سے بیاباں تک
دیوانے پہ جو گزری سمجھانے سے کیا حاصل

.....

جہاں سے بڑھتے ہیں صحرا کی سمت دیوانے
وہیں کہیں سے چمن کا بھی راستہ ہوگا

.....

گلستانوں سے رونق کی بیابانوں سے ویرانی
نہ جانے کتنی طاقت صرف کی تعمیر زنداں پر

.....

جی چاہتا ہے قصہ غم مختصر نہ ہو
ایسی بھی ایک رات ہو جس کی سحر نہ ہو
منزل کا کیا سوال ہے اے اضطرابِ شوق
وہ راہ چل کہ ہم کو ہماری خبر نہ ہو
نیّر سکون موت ہے طوفاں ہے زندگی
وہ موج ہی نہیں جو آشفتہ سر نہ ہو

ٹھہرو ذرا سا لال و گل کے قریب بھی
کتنا حسین ہے خون جگر دیکھتے چلو

ایک غزل کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں دیکھئے اس میں کس بلا کی روانی ہے اور سادگی بھی پائی جاتی ہے۔پڑھتے جایئے اور موج و مستی سے ساز دل چھیڑتے جائیں:

اس شہر تمنا میں چلا جو بھی اکڑ کر
وہ چوٹ لگی بیٹھ گیا سر کو پکڑ کر
ایسا نہ ہو اک دن دل آہن بھی پگھل جائے
دیوانے کو زنجیر میں باندھو نہ جکڑ کر
آہٹ پہ چلا جاتا ہے اندھے کی طرح عشق
پہنچاؤ درِ یار تلک ہاتھ پکڑ کر
اس آئینہ خانہ میں کوئی اور نہیں ہے
طائر نہ بنو اپنی ہی تصویر سے لڑ کر
کیا ہے در جاناں پہ جبیں سائی کا مقصد
تقدیر کے لکھے کو مٹاؤ نہ رگڑ کر

اس کے علاوہ نیر صاحب نے غالب کی پہلی غزل پر کس قدر کامیاب نظمیں لکھیں ہیں غور فرمائیں:

ہر نفس اپنا ہے پیہم سلسلہ زنجیر کا
قید ہستی نام ہے کس جرم کی تعذیر کا
ہے قلم کاری پہ کس کی شعبدہ تحریر کا
'نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا'
آخری بند ہے
ہے مری شعلہ نوائی کس قدر وحشت فزاء
نرم کر دیتی ہے آہن ساز دل کی ہر صدا
مجھ کو آزادی نے بھی بے چین ہی رکھا سدا
'بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا'

نیر صاحب نے قصائد کہتے وقت قدما کی روشنی سے ہٹ کر جدید انداز بیان کو اپنایا ہے۔ان کے قصائد زیادہ تر اسلامی نظریات پر لکھے گئے ہیں۔اس

لئے ان کا نظریہ ہے:

'قصائد میں بھی تمہید، تشبیب کی قدیم روایات سے احتراز کیا گیا ہے۔ کیوں کہ مقدس درباروں میں فضول باتیں کرنا بھی احترام دربار کے منافی سمجھتا ہوں۔'

چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کفر بے دینی میں جب سارا عرب تھا مبتلا
ایسے نازک دور میں اللہ اکبر کی صدا
بھا گئی مالن کو یہ اپنے پیمبر کی ادا
بہر رحمت یوں اٹھا صحرا گلستاں بن گیا

تلاش فن کے عنوان سے قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

موت سے کچھ کم نہیں غیبت کا طول انتظار
صبح تیری چاک دامن شام میری سوگوار
راز حق ایسا کہ جس کی خود مشیت پردہ دار
محرم ایسا جس پہ ہے راز دو عالم آشکار
کس طرح اپنی امانت میں نہ رکھے کردگار
صنعت خالق کا جب تو آخری ہے شاہکار

.....

آگے چل کر لکھتے ہیں:

چاہتا ہے ایک منزل ابن آدام کا فروغ
انقلاب نو کی خاطر ہے زمانہ بے قرار

.....

نقش ایسے دیکھنے کو مضطرب ہیں مہر و ماہ
ڈھونڈتی ہے تیری منزل گردش لیل و نہار
عرض ہے نیر کی مولا آیئے جلد آیئے
اہل ایماں کو نہیں ملتی کہیں جائے قرار

.....

کارواں گم کردہ منزل رہنما پردے میں ہے
اک بڑی مشکل یہ ہے مشکل کشا پردے میں ہے
دل ہے محروم تجلی، آنکھ محروم جمال
ہم خدا کو کیا کہیں جب ناخدا پردے میں ہے
خود خدا پردے میں ہے رازِ خدا پردے میں ہے
یہ مشیت ہے کہ نورِ مصطفیٰؐ پردے میں ہے
وہ جو کل تھا وجہ خلقت آج ہے وجہ قیام
ابتدا پردے میں تھی اب انتہا پردے میں ہے

دی ہے نیرؔ مجھ کو ساقی نے یہ کیسی خاص مے
سب کی نظریں اٹھ رہی ہیں میرے ساغر کی طرف

مدیر ماہنامہ 'شمع ادب' معروف شاعر، معتبر و مستند صحافی، سید توکل حسین نیر سلطانپوری، جن کی شاعری تصوف، احتجاج وانقلاب کی ایک موثر ترین آواز ہے، اور ان کی ادبی صحافت اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہے۔ ماہنامہ 'نیادور' بہت جلد نیرؔ سلطانپوری کی مجموعی ادبی خدمات پر ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کرنے جارہا ہے۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

نقد و تبصرہ

دنیا میں اہل علم وفکر کی کمی نہیں اور وہ ہمہ وقت دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے کلام سے اپنے فن اور اپنی فکر سے اس معمورۂ عالم کو برابر جلا بخش رہے ہیں۔ آج سائنس نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ فضاؤں میں ہزاروں برس پہلے کی آوازیں آج کے ماحول میں موجود ہیں۔ اور کبھی کبھی وہ ریڈیو کے ریسیور سے بھی ٹکراتی رہتی ہیں۔ جب کہ خلا میں یہ ساری آوازیں اور آج کے علماء و مفکرین کی ساری کاوشیں موجود ہیں۔ تو فطری بات ہے کہ حساس ذہن کی بالیدگی کے مطابق وصول کرتا رہتا ہے۔

آج کیا بات ہے کہ ساری دنیا میں جدید شاعری کی طرف عام رجحان پایا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو روایت پسند تھے اور کسی بھی قیمت پر اپنے روایتی اقدار سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اس عمر میں پہونچ چکے ہیں کہ پاس وضع بھی ان کو اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ بقول انہیں کے کچی عمر کے لڑکوں کے کھنڈر بے فکر و فن میں ابھی خود کو ملوث نہ کریں۔

کیا بات ہے کہ ہمیشہ کی طرح موجودہ دور میں بھی ایک ہی قسم کا تفکر ایک ہی قسم کی تخیل سازی دنیا کے ادیبوں اور مفکرین میں پائی جاتی ہے۔ کسی بھی زمانہ کا تجزیہ کیجئے دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں میں ایک قسم کے ادب کا شعور پایا جاتا ہے۔

نیرؔ سلطانپوری نے اردو شاعری کی من جملہ اصناف سخن میں اپنی فکر و کمال کے جوہر دکھائے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک زمانہ کو متاثر کیا ہے۔ چاہے وہ نظم گوئی کا میدان ہو یا غزل گوئی کا یا قصائد جیسی جاں سوز صنف سخن ہو۔ ہر ایک صنف سخن کو برابر کے خون جگر سے سیراب کیا لیکن یہی نیرؔ سلطانپوری جب نعت جیسی پاکیزہ اور مقدس ترین صنف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں تو سراپا عجز و انکسار کی صورت نظر آتے لگتے ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام کے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں:

در در جبیں جھکائی احساس کمتری نے
لاکھوں خدا بنائے انساں کی بت گری نے
صدقے میں مصطفیٰؐ کے جاگے شعور ذہنی

دھوکے دئے تھے ورنہ ہر نقش آزری نے
پیدا کیا دلوں میں احساس اشرفیت
منزل بلند کر دی تیری پیمبری نے
....
احمدؐ کے لئے زیبا ہے نورِ خدا کہنا
سایہ ہی نہ ہو جس میں اس جسم کا کیا کہنا
اللہ کا آوردہ بندوں کا نمائندہ
سردارِ دوعالم کے اعزاز کا کیا کہنا
توحید مقدم کی اقرار نبوت پر
ورنہ بہت آساں تھا بندے کو خدا کہنا

نیر صاحب جدید شاعری کے قائل نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ جہاں یوروپین کلچر کی تمام نقالیاں ہندوستان میں پناہ گزیں تھیں وہیں جدید شاعری نے بھی اپنا ایک مقام بنا لیا۔ حالانکہ اس میں ہوتا ہوا تا کچھ بھی نہیں۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ بجائے نظم کے اس کو نثر کہئے کیوں کہ جب ردیف و قافیہ اور وزن کی کوئی قید یا پابندی نہیں ہے تو نظم کہاں نثر ہے''۔ وہ آزاد نظم کے مخالف تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود بھی آزاد نظمیں کہیں ہیں۔ یہ نظم ملاحظہ کریں۔

نیا موڑ

روس نے جو کچھ کیا وہ امن عالم کے لئے
سامراجیت کا مقصد ہے کہ جنگ ہوتی رہی
تیرگی کی رہگزر پر بیٹھ کر
انتظار صبح نو کرتے چلو
زندگی شعلہ بہ ساغر مسکرانے ہی کو ہے
گنگنانے ہی کو
جلوہ دکھانے ہی کو ہے

شاعری میں جس طرح نیر صاحب خودکسی کے شاگرد نہیں تھے۔ اسی طرح انہوں نے بھی کسی کو اپنا باقاعدہ شاگرد نہیں بنایا۔ عام طور پر سلطان پور کے لوگ مجروں سلطان پوری کو نیر صاحب کا شاگرد مانتے و گردانتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اس سلسلے میں نیر صاحب کہتے ہیں:

''ہم نے اپنی طرف سے کسی کو بھی شاگرد نہیں بنایا جو بھی باذوق آدمی میرے پاس آکر اصلاح لیتا تھا تو میں اصلاح دیدیا کرتا تھا۔ اس بنا پر وہ مجھے استاد کہتے تھے۔ مجروح سلطان پوری ہمارے قریب ترین دوستوں میں سے ہیں۔ ہماری اور ان کی شاعری قریب قریب ساتھ ہی میں شروع ہوئی ہے۔''

شاگرد بنانے کے مقابلے میں نیر صاحب نے یقیناً کسر نفسی سے کام لیا ہے، ورنہ، سلام سلطان پوری، ڈاکٹر پی پیام بلرمپوری، گوکل پرشاد پاٹھک، جدرراج بلی عیشؔ، ڈاکٹر قیصر مرزا بیگ، آغا حسن آغا، رزمی سلطانپوری، عبدالحئی کامل کو کون نہیں جانتا کہ وہ ان کے باقاعدہ شاگرد رہے ہیں۔ یہاں تک سلام سلطانپوری نیر صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے، وہ ابتدا میں اپنا کلام پڑھا کرتے تھے لیکن خوش گلو شاعر ہونے کی وجہ سے نیر صاحب کا بھی کلام مشاعروں میں پڑھتے تھے۔

نیرؔ سلطانپوری صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک پایہ درجہ کے ادیب اور صحافی بھی تھے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران ۱۹۴۰ء میں ایک ادبی ماہنامہ ''فردوس'' کئی سال تک نکالتے رہے لکھنؤ سے جب سلطانپور آئے تو انہوں نے ۱۹۵۹ء میں سلطان پور سے بھی ایک رسالہ 'شمع ادب' کے نام سے فراق گورکھپوری کی سرپرستی میں شائع کیا۔ جس میں اس دور کے اہم تخلیق کاروں کے مضامین اس میں متواتر شائع ہوتے رہے۔ خاص کر فراق گورکھپوری، پروفیسر عقیل، پروفیسر نیر مسعود، پروفیسر مجاور حسین، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر فضل امام، پروفیسر جعفر رضا، مجروح سلطانپوری، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، پروفیسر شارب ردولوی، بشیر بدر، وسیم بریلوی، ماہر لکھنوی اجودھیا پرشاد شریواستو ذبیح، (جوڈیشنل افسر) لکھپت رائے محورؔ، خرد فیض آبادی، نثار سلیمانی، فگارؔ اناوی، عبدالہادی قادری حیدرآبادی، شیام لال ورما مست، حضرت شوق بہرائچی، حمید قیصر الہ آبادی، سید فاروقی خیرآبادی، ہادی اعظمی، کامل بلند شہری، بیخود وارثی علیگ، مجیب عزمیؔ ماہر الحمیدی الہ آبادی، شاہ جہاں بانو یادؔ دہلوی، سیٹھ جمال صدیقی، معین الدین منیفؔ اعظمی، غلام احمد عرفان اعظمی، قاسم شبیر نصیرآبادی، آفتاب لکھنوی، ساحر لکھنوی، بھگوتی پرشاد عاجزؔ، عمر انصاری، سید احتشام حسین، سرپٹ لکھنوی، ماچس لکھنوی وغیرہ یہ سلسلہ گیارہ برس تک چلتا رہا مگر سلطانپور میں پریس نہ ہونے اور باقاعدہ طور پر کسی کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے ۱۹۷۰ء میں اس ادبی رسالہ کی اشاعت بند ہوگئی۔ اس میں شائع ہونے والے قلمکاروں کی فہرست بہت طویل ہے جس کا ذکر کرنا ایک تفصیل طلب کام ہے۔

اس رسالہ میں ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے مضمون نگار ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جنہیں زبان و قلم پر ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔

دو مجموعہ بھی 'انوار عرفاں' اور 'ریزہ مینا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نیر سلطانپوری کے ادبی خدمات پر اگر ریسرچ ہوتی تو اردو ادب میں اضافہ کا سبب ہوتا۔ لیکن یہ کام ابھی ممکن نہیں ہو سکا۔ جیسا کہ سننے میں آرہا ہے کہ ماہنامہ نیا دور ان کے ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک خصوصی نمبر کی اشاعت کرنے جا رہا ہے، یہ ایک اچھی پیش رفت ہے۔

نظم و نثر کی خداداد صلاحیت رکھنے والا شاعر و ادیب آخر کار ۱۵ر اگست ۱۹۸۵ء کو اس دنیائے فانی کو الوداع کہا اور جاتے جاتے اپنی بے بسی کا اظہار یوں کر گیا:

نیر میں اپنی بات کہاں تک لکھا کروں
اب تو قلم بھی کرتا ہے تحریر سے گریز
کچھ بارگاہ ناز کے آئین بھی سخت ہیں
کچھ ہے مری دعا کو بھی تاثیر سے گریز

□□□

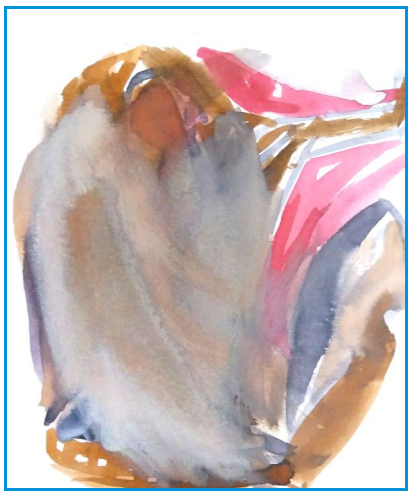

غالب اور اقبال

محمودہ خاتون

بھٹی جرولی

پوسٹ کٹاواں، سلطانپور

رابطہ: 8756228058

غالب جس عہد میں سانس لے رہے تھے وہ تاریخ ہند کا اہم ترین باب ہے۔ قدیم تہذیب دم توڑ رہی تھی اور اس کی جگہ نئی تہذیب کی آمد آمد تھی۔ غالب کو نئی تہذیب کی بالادستی کا قدرے احساس ہو چلا تھا، اس نے نئی تہذیب کو گلے لگانے پر خود کو آمادہ کرلیا تھا۔ ان کے اس سفر سے ان کی ذہنی کوائف کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

وہ محفل شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھے تھے کہ بس لذت خواب سحر گئی

غالب کو دربار مغلیہ میں بڑی عزت و توقیر حاصل تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا انہیں استاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایام غدر میں سکہ لکھنے کا الزام بھی ان پر لگا تھا بایں ہمہ انھیں خود کو بے گناہ ثابت کرنے اور برٹش حکومت کا خیر خواہ ثابت کرنے کے لئے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں کئی قصائد پیش کرنا پڑا۔ حالانکہ یہی قصیدہ وہ اس سے پہلے مسلم حکمرانوں کو نذر کر چکے تھے۔ لکھ کر انہوں نے غدر سے بے تعلقی ظاہر کر کے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اقبال جس عہد میں سانس لے رہے تھے سارا ملک انگریزوں کی گرفت میں آچکا تھا اور انگریزی تعلیم کی برکات سے ملک عزیز کا ایک طبقہ فیضیاب ہو چکا تھا اور انگریزوں کا وفادار بن کر ہر قسم کی سرکاری مراعات (ملازمت، جاگر اور خطابات) حاصل کر رہا تھا۔ تعلیم یافتہ افراد جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ملک کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرانے کا خواب دیکھ رہا تھا اس کے ساتھ ہی نشاۃ ثانیہ کی تحریک ہندوستانی عوام کے دل و دماغ پر اپنا گہرا رنگ چھوڑ رہی تھی۔ ملک میں آریہ سماجی اور شدھی کرن کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ عالم اسلام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ نے عرب عصبیت کو از سر نو زندہ کر دیا تھا اور فرانس اور برطانیہ کی چیرہ دستی نے عرب ممالک کو کئی حصے میں کر دیا تھا۔ خود ترکی کا ایک حصہ پر اغیار کا قبضہ و دخل ہو چکا تھا۔ اقبال نے ان حالات کا جائزہ لیا اور اپنی فکر انگریز شاعری میں ان پر دوٹوک تبصرہ بھی کیا غالب نے نئی تہذیب کو بہ نظر استحسان دیکھا تھا اقبال نے مغربی تہذیب کے باطن میں اتر کر اس کے زوال پذیر ہونے اور دم توڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ انہوں نے ڈوائن کامیڈی کے جواب میں جاوید نامہ لکھ کر مغربی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔

اقبال اپنے عہد کے بڑے دانشور شاعر ہیں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔ غالب اور اقبال دونوں کے یہاں رجائیت کا تبصرہ غائب ہے ۔غالب کی شاعری جہاں گلشن نا آفریدہ کی جانب اذہان کو راغب کرتی ہے وہیں اقبال کرہ ارض کو بار بار دیکھتے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غالب اور اقبال دونوں کو فارسی شعر و ادب کا زبردست عرفان تھا۔غالب اپنے اردو کلام کو بے رنگ قرار دے کر فارسی شاعری کا مطالعہ کرنے پر اصرار کرتے ہیں جبکہ اقبال اپنی شاعری کا بہترین اور قابل قدر سرمایہ فارسی زبان میں پیش کر کے فارسی ادب میں بھی معقول اور مناسب جگہ بنائی تھی۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے غالب اور اقبال کے اساسی فرق پر روشنی ڈالی ہے:۔

''اقبال اور غالب میں ایک اساسی فرق ہے۔اقبال نے اپنی شعری کائنات کو اس مرکزی اور مضبوط نظام فکر سے سمایا ہے جسے انہوں نے مختلف سرچشموں سے فیضان حاصل کر کے مرتب کیا ہے۔وہ سرچشمے یہ ہیں،قرآن کریم ،فارسی شعراء اسلامی اور مغربی مفکرین جدید علوم اور سائنس ،غالب کے لئے کوئی نظام فکر یا زندگی کی کوئی تعبیر مکمل اور بصیرت افروز تجربہ نہیں بن سکی۔اس لئے ان کی شاعری ان مجردات کا قطعی بیان ہے جو انہوں نے اپنے تجربے سے آخذ کئے ہیں۔یہ بڑی حد تک اس شاعری کے مماثل ہے جسے ہربرٹ ایڈ نے فکر کے جذباتی یا حسیاتی ادراک سے تعبیر کیا ہے اور جس کا مجموعی اثر احساس حیرت کے پھیلاؤ اور ادراک کے تناؤ کی آمزش میں مضمر ہے''۔

(تحقیق وتنقید ص134)

غالب اور اقبال دونوں نے تصوف سے دلچسپی لی۔غالب عملاً صوفی نہ تھے لیکن ان کی فکر میں وحدت الوجود کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔وحدت الوجود یوں کے نزدیک کائنات خدا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔

غالب ہند اسلامی معاشرے کے ممتاز فرد تھے انہیں اپنے آباؤ اجداد پر فخر تھا انہیں مغرب سے درآمد شدہ کلچر کا تھوڑا بہت ادراک تھا جبکہ اقبال کو مشرق اور مغرب دونوں تہذیبوں سے روبرو ہونے کا موقع ملا تھا۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

یورپ کے قیام کے دوران مغربی تہذیب کا کھوکھلا پن ان پر ظاہر ہوگیا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب وتمدن پر اپنے اشعار کے ذریعہ کاری ضرب لگائی۔آزادی رائے۔جمہوریت،فسطائیت اور مشینی تہذیب کے کھوکھلے پن کو انہوں نے اپنی گرانقدر شاعری کا موضوع بنایا جبکہ غالب اپنی ذات کے خول میں بند رہتے اور ہر لحہ ٹوٹتی ہوئی ہندی مغل تہذیب کا نوحہ پڑھتے ہی میں خود کو محدود رکھا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ خول کے باہر نکلنے کی کوشش میں شکست خوردگی کے شکار ہوگئے جبکہ اقبال مغربی تمدن کے ریلے کو ایک مبصر کی طرح دیکھ رہے تھے اور اس کی ناپایدگی کا احساس دلا رہے تھے اقبال اور غالب دونوں کے دلوں میں وطن عزیز کی آزادی کی تڑپ تھی۔غالب اس اک اظہار کھل کر نہیں کر سکتے تھے جبکہ اقبال تصویر دہر اور ایک پرندے کی فریاد جیسی نظموں کے ذریعہ ابنائے وطن کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر رہے تھے۔غالب ہمیں تو ہم میں تبدیل کرتے ہیں تو اقبال جماعت (معاشرے) سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جداگانہ وجود کو قائم رکھنے پر زور دیتے ہیں۔غالب کا کینوس چھوٹا ہے جبکہ اقبال کا کینوس کافی وسیع ہے اس کی شعری کائنات میں عرش وفرش ،شرق وغرب ،شمال و جنوب،بحر و بر جلوہ فرما ہیں۔شرق ومغرب میں اتنی وسیع شعری کائنات شاید کسی کا ہو۔غالب کی رسائی غزل اور قصیدہ تر رہی لیکن اقبال نے غزل اور نظم پر دو اضافے میں فکر انگریز اور پرشکوہ شاعری کر کے ساری دنیا کو اپنی جانب متوجہ کیا جبکہ غالب کی غزل ریزہ خیالی کی عمدہ مثال ہے۔غالب اور اقبال دونوں نے روش عام سے ہٹ کر شعر گوئی کی دونوں کو مجتہد شعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں میر کے بعد اور اقبال سے پہلے غالب ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جنہیں کو عہد آفرین کہا جاسکتا ہے وہ میر اور اقبال دونوں سے زیادہ قوی اور موثر شخصیت رکھتا تھا اردو شاعری کی آنے والی نسلوں پر جہاں شعوری اور دیرپا اثر غالب رہا ۔میر کا نہیں رہا۔اقبال کے شعری کردار کی تشکیل وتربیت میں موثرات کے ساتھ ساتھ غالب کا اثر ایک نمایاں اور اہم حیثیت رکھتا ہے۔غالب جس قدر اپنے زمانے کا مخلوق تھا اس سے بہت زیادہ نئے زمانے کا آفریدگار تھی۔وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے ذہن کی تعمیر میں خارجی حالات واسباب کی غیر شعوری کارفرمائی جس قدر بھی رہی ہو لیکن وہ کسی خاص تحریک کا نتیجہ نہیں تھا وہ تاریخ کی فطری اور بے ساختہ تھا۔

(ادب اور زندگی ص318)

اقبال کو غزلیں جہاں عمیق مطالعہ اور مشاہدہ کی غماز ہیں وہیں انہوں نے فلسفیانہ اور منظم اذکار کو اس ترتیب سے پیش کیا ہے کہ ذرا بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔فن کے مجروح ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔غالب کی بنائی ہوئی راہ پر سیکڑوں مسافر چل پڑے لیکن اقبال نے خود ڈگر بنائی تھی اس پر کامیابی کے ساتھ دو چار لوگ ہی چل پائے اکثر و بیشتر راستے میں ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑے۔بقول مجنوں گورکھپوری'' آج غالب نہ ہوتا تو حالی اور اقبال کی متوازن سنجیدہ اور زندگی سے آنکھیں ملا سکنے والی وجود میں نہ جانے کتنی دیر لگتی اور ہماری اردو شاعری موجودہ منزل تک نہ جانے کب پہنچتی۔سینٹسری نے ایک موقع پر کہا ہے کہ نے ٹینی سن کو پیدا کیا اور ٹینی سن نے باقی تمام شعراء کو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے اقبال کو پیدا کیا اور اقبال نے بعد کے تمام شعراء کو۔

(ادب اور زندگی ص342)

❑❑❑

بانو قدسیہ کی ناول نگاری

ڈاکٹر صفیہ فاطمہ

نیپئر روڈ، پارٹ ۲
ٹھاکر گنج، لکھنؤ

رابطہ: 9389018300

بانو قدسیہ کا نام اردو ناول کی تاریخ میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اردو ناول کے علاوہ انہوں نے متعدد افسانے اور ڈرامے بھی تصنیف کیے ہیں۔ مصنفہ کا پہلا ناول ''شہر بے مثال'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''راجہ گدھ''، ''بازگشت''، ''آتش زیر پا'' اور ''حاصل گھاٹ'' مصنفہ کے اہم ناول ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت انہیں ''راجہ گدھ'' کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ ''راجہ گدھ'' ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اردو ناول کی تاریخ میں اسے ایک الگ انداز کا ناول قرار دیا گیا جس کی اہم وجہ ناول کا موضوع ہے۔ انسانی دیوانگی کے اسباب کو مصنفہ نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر وہ کیا وجہ ہے جس سے انسانوں کے دل و دماغ پر یہ دیوانہ پن حاوی ہو جاتا ہے۔ انسانی دیوانہ پن کے متعلق اپنے نظریات کو واضح کرنے کے لیے مصنفہ نے مختلف دلیلیں پیش کی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس موضوع پر ان سے قبل کسی مرد یا خاتون ناول نگار نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔ ناول میں راجہ گدھ کی تمثیل کے ذریعہ مصنفہ نے اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ لیکن ایک بات اس ناول کے متعلق بتانا ضروری ہے کہ یہ طویل ناول دلچسپی سے خالی ہے۔ یہ ناول عام قاری کی فہم سے بالا ہے۔ ساتھ ہی ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات واقعات کو محض صفحات میں اضافہ کرنے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً عزیز گاتن اور موسی الفت کا قصہ اتنا اہم نہیں معلوم دیتا ہے کہ اس کے بغیر ناول نامکمل نظر آئے۔ ساتھ ہی ناول میں تسلسل کی کمی نظر آتی ہے اور نہ ہی کسی مقام پر قاری کو یہ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ بہر حال ان خامیوں کے باوجود ''راجہ گدھ'' ایک اہم ناول ہے۔ اب ہم ناول کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس کی خصوصیات اور خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ناول کا موضوع انسانی دیوانگی کے اسباب تلاش کرنا ہے سب سے پہلے مصنفہ نے ''عشق لاحاصل'' کو انسانی دیوانہ پن کی وجہ بتایا ہے۔ سیمی شاہ، آفتاب اور قیوم کی تکونی محبت کی داستان کے ذریعہ مصنفہ اپنے نظریات کو واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ناول کی ابتدا پروفیسر سہیل کے سوشیالوجی کی کلاس سے ہوتی ہے۔ ناول میں پروفیسر سہیل ایک ایسا کردار ہے جس کی زبانی مصنفہ انسانی دیوانہ پن کے متعلق اپنے نظریات کو قاری تک پہنچاتی ہیں لہٰذا پروفیسر سہیل تعارفی کلاس کے بعد اپنے شاگردوں

سے انسانی دیوانہ پن کی وجہ تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں اور اس موضوع پر کافی طویل بحث ہوتی ہے۔ اسی بحث کے دوران انسانی دیوانہ پن کی پہلی وجہ ''عشق لاحاصل'' کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ ناول سے مثال ملاحظہ کیجئے:

''سر دیوانہ پن کی صرف ایک وجہ ہے۔
ماحول۔ ماحول۔ ماحول۔''
ایک طرف سے آواز آئی۔
''سر انسان میں پیدائشی نقص ہوتا ہے۔''
'Sir Biological Repression'
''مانے نہ مانے کوئی.....اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے.....صرف ایک وجہ عشق لاحاصل.....عشق لاحاصل.....عشق کا حاصل...''
''بھنگڑا ڈالنے کے انداز میں آفتاب کرسی پر چڑھ کر چلایا۔''
(راجہ گدھ، علامہ اقبال سائبر، لائبریری ص/۹)

اس کے بعد شروع ہوتی ہے سیمی، آفتاب اور قیوم کی تکونی محبت کی داستان یا یہ کہہ لیجئے کہ مصنفہ کی تلاش شروع ہوتی ہے کہ کس طرح محبت میں ناکامی انسانی ذہن میں دیوانگی کے اثرات پیدا کر دیتی ہے۔ سیمی اور آفتاب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، دوسری طرف قیوم سیمی سے ایک طرفہ محبت کرتا ہے۔ لیکن سیمی اور آفتاب ایک نہیں ہو پاتے ہیں اور آفتاب کی شادی اس کی کزن زیبا سے ہوجاتی ہے۔ سیمی یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتی ہے اور دیوانگی کی طرف قدم بڑھانے لگتی ہے اور قیوم کو جو آفتاب کا روم میٹ تھا سیمی اسے آفتاب کی قربت کا ایک ذریعہ تلاش کرتی ہے ادھر قیوم جو سیمی سے بے حد محبت کرتا ہے، آفتاب اور سیمی کے درمیان کی کڑی ہے۔ قیوم سے سیمی آفتاب کے متعلق گفتگو کرتی ہے کیونکہ کوئی اور نہیں ہے جس سے وہ آفتاب کی باتیں کر سکے لیکن قیوم سیمی کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی محبت حاصل کرنے کی غرض سے جسمانی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ سیمی محض اس لیے اعتراض نہیں کر پاتی ہے کیونکہ وہ آفتاب کے لاحاصل عشق کی وجہ سے اس قدر دیوانی ہوجاتی ہے کہ وہ قیوم سے آفتاب کے متعلق گفتگو کر کے دلی تسکین حاصل کرتی ہے۔ ساتھ ہی خود کو ٹھکرائے جانے کے احساس سے بھی چھٹکارا پانا چاہتی ہے کہ کوئی ہے جو اسے بے انتہا چاہتا ہے اور یہ احساس اسے ایک ذہنی سکون بخشتا ہے اور دیوانگی کی آخری منزل یعنی خودکشی کرنے سے روکتا ہے۔ اس طرح مصنفہ عشق لاحاصل کو انسانی دیوانہ پن کی وجہ قرار دیتی ہیں۔ ناول سے وہ مقام ملاحظہ کیجئے جب سیمی قیوم سے اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ اس کی بے پناہ محبت نے اسے خودکشی کرنے سے روک رکھا ہے:

''آ گئے.....مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔''
''کیسے؟''
''مریض کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آئے گا۔''
(راجہ گدھ۔ص/۱۲۴)

''اگر تم نہ ہوتے قیوم تمہاری ہمدردی، محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کی خودکشی کر لیتی۔ تمہاری محبت نے مجھے یہ قدم اٹھانے نہیں دیا جب مجھے پورا یقین ہوجاتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں.....تو یہ تمہاری ہمدردی محبت ہے جو مجھے مجھ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہے۔.....''
(راجہ گدھ۔ص/۱۴۱)

دھیرے دھیرے یہ دیوانہ پن سیمی کے پورے وجود پر چھانے لگتا ہے۔ وہ دیوانہ پن کی آخری منزل یعنی موت کی طرف قدم بڑھانے لگتی ہے لیکن قیوم کے ساتھ جسمانی تعلقات یا یوں کہہ لیجئے کہ مصنفہ کے مطابق جنسی طاقت سیمی کو ایسا کرنے سے روکتی ہے۔

قیوم کی ہر جائز، ناجائز کوشش کے بعد اسے یقین ہوجاتا ہے کہ بھلے ہی اسے سیمی کی قربت حاصل ہوگئی ہو لیکن وہ اس کی محبت سے ہمیشہ محروم رہے گا۔ اسی لیے قیوم سیمی سے تعلقات ختم کر لیتا ہے اور جو جنسی طاقت سیمی کو خودکشی کرنے سے روکتی ہے قیوم کے چھوڑ جانے کے بعد سیمی کی دیوانہ پن کا خاتمہ موت کے ساتھ ہوجاتا ہے۔

سیمی کے بعد قیوم کا کردار بھی اسی لاحاصل عشق کا شکار نظر آتا ہے۔ ایک بات قابل غور ہے کہ سیمی سے جدائی کے بعد مصنفہ قیوم کی بیماری کا ذکر بہت تفصیل سے کرتی ہیں جو کہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ محبت میں ناکامی انسان پر دیوانگی کے اثرات کو نمایاں کر سکتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں السر کی بیماری ہونا ناممکن ہے اس لیے ناول میں قیوم کی بیماری کی تفصیل فضول معلوم ہوتی ہے اور اصل قصے سے اس کا کوئی واسطہ نظر نہیں آتا ہے۔ سیمی سے جدائی کے بعد قیوم ریڈیو اسٹیشن پر ملازمت کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں عابدہ داخل ہوتی ہے۔ عابدہ شادی شدہ عورت ہے وہ ایک بچے کی خواہش رکھتی ہے لیکن اپنے شوہر کی رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ محروم ہے اور ایک دوست کی حیثیت سے اپنی باتیں قیوم سے بتاتی ہے۔ دوسری طرف قیوم کی ملاقات ایک بار پھر پروفیسر سہیل سے ہوتی ہے اور وہ قیوم کو دیوانہ پن سے بچنے کے لیے جنسی طاقت آزمانے کی صلاح دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قیوم عابدہ کی کمزوری کو سیڑھی بنا کر اس سے جنسی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ مصنفہ نے قیوم کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ابتدا سے ذہنی طور پر بیمار نظر آتا ہے ساتھ ہی جنسیات کا شکار بھی نظر آتا ہے اور ہر بار اس کی ذہنی سکون کی تلاش جنسیات پر آ کر ختم ہوجاتی ہے چاہے وہ سیمی سے محبت حاصل کرنا ہو یا دیوانے ہونے کا ڈر۔ دوسری طرف ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر کی زبانی ذہنی سکون تلاش کرنے کے لیے جنسیات کا سہارا لینے کی صلاح دینا بھی

کافی عجیب لگتا ہے۔ پروفیسر سہیل کی اس صلاح کا اثر قیوم پر اس قدر پڑتا ہے کہ وہ عابدہ سے جنسی تعلقات قائم کرلیتا ہے۔

دراصل مصنفہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسان کو عشق حاصل نہیں ہوتا ہے تو وہ ذہنی (Control) کنٹرول کھودیتا ہے جس کی وجہ سے وہ دیوانہ پن کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور اس کا واحد علاج انہوں نے جنسی طاقت میں پوشیدہ بتایا ہے پھر چاہے وہ کسی جائز طریقے سے ہو یا ناجائز۔ اسی جنسی طاقت کو مصنفہ نے بلبل کی زبانی بنارس کے ایک سنیاسی کا قصہ بیان کرکے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال ملاحظہ کیجئے:

''میں نجد کی رہنے والی ہوں میرا شیخ جب تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کا سفر کرتا ہے تو مجھے سونے کے پنجرے میں ساتھ رکھتا ہے ایک مرتبہ مجھے بنارس کے ایک سنیاسی نے بتایا تھا کہ انسان کے دیوانے پن کی اصل وجہ کیا ہے:

بول.....بتا.....سربستہ راز کھول۔''

''انسان کی ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنسی استعمال نہیں کرتا بلکہ طاقت کے اس مشکی گھوڑے کو انسان اپنی رانوں میں دبا رکھتا ہے اس گھوڑے پر انسان کے رانوں کی سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے۔''

(راجہ گدھ۔ص/۲۶)

مصنفہ یہ بات بار بار واضح کرنا چاہتی ہیں کہ ''عشق لاحاصل'' ہی انسانی ذہن میں دیوانگی کے اثرات پیدا کردیتا ہے لیکن جنسی طاقت اسے دیوانہ ہونے سے روکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیمی آفتاب سے دھوکہ کھاتی ہے تو دیوانے پن سے بچنے کے لیے قیوم سے جنسی تعلقات قائم کرتی ہے اور پھر قیوم اسی دیوانگی سے بچنے کے لیے پہلے عابدہ اور پھر امتل سے جنسی تعلقات قائم کرلیتا ہے۔

عابدہ کے بعد قیوم کی زندگی میں امتل داخل ہوتی ہے۔ امتل ایک مڈل کلاس طوائف ہے جو کام کی تلاش میں ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگایا کرتی ہے کہ شاید کوئی چھوٹا موٹا گانے کا پروگرام مل جائے اور اسے کچھ روپیے مل جائیں۔ مصنفہ نے امتل کے کردار کے ذریعہ ان طوائفوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے جو جوانی کی دہلیز پار کرتے ہی پریشانیوں میں گرفتار ہوجاتی ہے اور اپنے ماحول میں عزت پانے کے لیے قیوم جیسے لوگوں سے ہمدردی حاصل کرتی ہیں۔

اگر امتل کے پورے قصے پر غور کیا جائے تو یہ کسی خاص مقصد کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے اور نہ ہی کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر امتل کا کردار نہ ہوتا تو ناول نامکمل تھا۔ امتل کے بعد قیوم کی زندگی میں روشن آتی ہے ایک بیوی کی حیثیت سے۔ اور قیوم کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اب اس کا دیوانہ پن ختم ہوجائے گا کیونکہ روشن کی محبت اس کے وجود کی ساری کشمکش کو ختم کردے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے اور شادی کی پہلی رات قیوم کے ارمانوں پر پانی پھر جاتا ہے جب اسے یہ پتہ ہے کہ جس لڑکی کو وہ باکرہ جان کر بیاہ لایا تھا وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے اور اسی کا بیج روشن کے بطن میں پرورش پا رہا ہے۔ قیوم روشن کو اس کے محبوب سے ملا دیتا ہے اور پھر ذہنی سکون تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔

مصنفہ نے ''عشق لاحاصل'' کو انسانی دیوانگی کی وجہ بتاتے ہوئے اس کے علاج کو جنسی طاقت میں پوشیدہ بتایا ہے لیکن ایسا ضروری نہیں کہ عشق میں ناکام شخص کسی نہ کسی سے جنسی تعلقات قائم کرلے وہ بھی محض اس لیے کہ اسے اس احساس سے نجات مل جائے کہ وہ کسی مصرف کا نہیں ہے۔ اسے کوئی نہیں چاہتا۔ مصنفہ نے جنسی طاقت کو اتنی زیادہ اہمیت دی ہے کہ ان کے کردار اسی طاقت میں اپنا علاج ڈھونڈھتے نظر آتے ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مصنفہ کے یہ جنسی نظریات انہیں بھی ان خواتین قلم کاروں کی صف میں لاکر کھڑا کردیتے ہیں جنہوں نے فرائڈ کے جنسی نظریات کو تسلیم کرلیا ہے۔ یہ خیالات کافی حد تک درست بھی ہیں۔ کیونکہ پورے ناول میں مصنفہ نے اپنے جنسی نظریات کو منوانے کے لیے دلیلیں پیش کی ہیں۔ لیکن ان کی دلیلوں میں کچھ دم نظر نہیں آتا ہے اور نہ ہی یہ اپنے قاری کو اس بات پر آمادہ کرسکیں کہ عشق لاحاصل سے پیدا شدہ دیوانہ پن کا علاج جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی عشق لاحاصل سے دیوانہ ہونے والی تھیوری میں کوئی جان ہے کیونکہ محبت زندگی کا ایک اہم حصہ ضرور ہوتی ہے لیکن زندگی محض محبت پر ہی ختم نہیں ہوتی۔

''عشق لاحاصل'' کے علاوہ جو دوسری وجہ مصنفہ نے انسانی دیوانگی کی تلاش کی ہے وہ ایک حد تک قابل قبول ہے۔ یہ دوسری وجہ ''رزق حرام'' ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ جب حرام رزق انسان کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو خون کی تاثیر بدل جاتی ہے اور پھر نسل در نسل انسانوں میں دیوانگی کے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ اپنی اس تھیوری کو واضح کرنے کے لیے مصنفہ کو ایک بار پھر پروفیسر سہیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ناول میں پروفیسر سہیل کی واپسی ہوتی ہے۔ قیوم کی ملاقات پروفیسر سہیل سے ہوتی ہے لیکن اس بار وہ اس پروفیسر سہیل سے ملاقات کرتا ہے جو کئی سال مغرب میں گذار کر لوٹے ہیں نئے نظریات کے ساتھ۔ اب پروفیسر سہیل اپنے محبوب شاگرد کو دیوانہ پن کی ایک نئی تھیوری سمجھاتے ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجئے:

''مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور ہی نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی Genes کو متاثر کرتا ہے، رزق حرام سے ایک

خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات شراب اور Rediationry سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو Genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتی بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں نسل انسانی سے۔ یہ جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان Genes کے اندر ایسی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرلو رزق حرام سے تمہاری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم حرام رزق کھاتے ہیں لپکا پڑ جاتا ہے۔''

(راجہ گدھ۔ص/۲۱۵)

اس کے علاوہ مصنفہ نے راجہ گدھ کی تمثیل پیش کرکے بھی اپنے نظریات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرندوں کی زبانی وہ اپنے رزق حرام کی تھیوری کو اور واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مصنفہ کے ان نظریات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ناول سے وہ مقام ملاحظہ کیا جائے جہاں رزق حرام کے متعلق اپنے نظریات کو پیش کرتی ہیں:

''.....گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانے کا سبق سیکھا..... یہ لمبی داستان ہے آقا بہت لمبی.....لیکن اتنی بات طے ہے کہ جو کچھ بھی دیوانگی اس وقت گدھ میں مقسوم ہے یہ سبق اس نے صرف انسان سے سیکھا ہے۔''

.....

''اور چیل جاتی کا خیال ہے جو کوئی بھی رزق حرام کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں اس کے لہو میں ساخت کچھ اس طرح بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔''

(راجہ گدھ۔ص/۲۳۰)

اس طرح مصنفہ نے رزق حرام کو بھی انسانی دیوانہ پن کی ایک اہم وجہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس تھیوری کو اور واضح کرنے کے لیے مصنفہ نے حضرت آدم کا قصہ بیان کیا ہے کیونکہ آدم نے جنت میں گندم کھایا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا تھا اس رزق حرام کے کھانے کی وجہ سے انہیں جنت سے بے دخل کرکے زمین پر بھیج دیا گیا لیکن توبہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی لیکن جو رزق حرام وہ جنت میں کھا چکے تھے اس کا اثر ان کی آنے والی نسلوں میں موجود تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ یوں تو یہ تھیوری اور دلیلیں کافی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ لیکن پورے طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اگر آدم کے رزق حرام کھانے کی وجہ سے آج تک نسلوں میں اس کا اثر موجود ہے تو ہر انسان کو دیوانہ ہی ہونا چاہئے تھا۔ میں اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتی ہوں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص رزق حرام کھاتا ہے تو اس کے نتیجے میں دیوانہ ہوسکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ نسل در نسل اس کا اثر موجود رہے۔ ایسا ضروری نہیں کہ ایک بے ایمان شخص کا بیٹا بھی لازمی طور پر بے ایمان ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ایک ایماندار شخص کی اولاد ایماندار ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں صرف دیوانہ پن ہی باقی رہ جاتا کیونکہ ہم سب حضرت آدم کی ہی نسل سے ہیں۔ اس لحاظ سے اس تھیوری میں بھی زیادہ دم نظر نہیں آتا۔ مصنفہ کی اس تھیوری کے متعلق مثال ملاحظہ کیجئے:

''.....جب حضرت آدم نے توبہ کی اور ان کے رب نے توبہ قبول کی تو پھر دنیا میں حضرت آدم کے لیے تمام پاک اور طیب چیزوں کو مہیا کیا گیا۔ لیکن وہ رزق حرام جو وہ بہشت میں کھا چکے تھے اس کے اثرات ان کی نسلوں میں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہی رزق حرام کھانے کی سزا مقرر ہوئی۔''

(راجہ گدھ۔ص/۲۲۹)

شاید یہ تھیوری پیش کرتے ہوئے مصنفہ یہ بھول گئیں کہ اگر کسی کو اس کے گناہوں کی توبہ کرنے پر معاف کردیا جاتا ہے تو پھر اس کی سزا مقرر نہیں کی جاتی۔ مصنفہ نے رزق حرام کی تھیوری کو صحیح ثابت کرنے کے کئی دلیلیں پیش کی ہیں لیکن کوئی بھی دلیل اتنی پختہ نہیں ہے کہ قاری ان کی بات ماننے پر مجبور ہوجائے۔ ہر دلیل میں کچھ نہ کچھ کمی واضح طور پر نمایاں ہے۔

ناول میں مصنفہ نے انسانی دیوانہ پن کی دو وجہیں تلاش کی ہیں پہلی ''عشق لاحاصل'' دوسری ''رزق حرام''۔ لیکن بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ اگر انسان کو موت کا ڈر نہ ہوتا تو انسان کبھی دیوانہ نہیں ہوتا۔ یہ موت کا ڈر ہی ہے جو اسے دیوانہ بناتا ہے۔ اس بات کو بھی واضح کرنے کے لیے مصنفہ نے راجہ گدھ کو ہی ذریعہ بنایا۔ جنگل کے جب سارے جانور راجہ گدھ کی دیوانگی کے اسباب تلاش کررہے تھے اور طرح طرح کی دلیلیں پیش کررہے تھے تب راجہ گدھ کی زبانی مصنفہ دیوانہ پن کا راز کھول دیتی ہیں۔ راجہ گدھ جانوروں کو اپنی دیوانہ پن کا راز بتاتا ہے کہ کس طرح ایک جوگی کا خون اتفاقاً اس کے حلق سے اتر گیا تھا اور اسی وجہ سے اسے موت کا ڈر ستانے لگا۔ ساتھ ہی اس حادثے کے بعد ہی وہ مردار بھی کھانے لگا۔ مصنفہ اس تمثیل کے ذریعہ رزق حرام کی تھیوری کو بھی پیش کررہی ہیں۔ ناول سے وہ مقام ملاحظہ کیجئے۔ جب راجہ گدھ اپنی دیوانگی کی وجہ بتاتا ہے۔

''.....وہ آنکھیں بند کرکے گویا ہوا.....

آقا میں بھی تمام پرندوں کی طرح معصوم تھا اور اپنی سرشت بھی نیکی اور بدی کے سہارے زندگی بسر کررہا تھا میرے اندر اپنے متعلق کوئی شبہ موجود نہ تھا نہ اپنے گردوپیش کے متعلق تجسس۔ لیکن جس درخت پر بیٹھ کر شکار کے لیے نگاہیں دوڑایا کرتا

اس کے نیچے ایک جوگی نے آکر بسیرا کرلیا.....
ایک روز اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔
.....ہم دونوں روز کچھ دیر کے لیے یکجا ہوتے وہ مجھے زندگی کے راز سمجھاتا.....تمام آرزوؤں سے چھٹکارا پالینے کے بعد اب وہ ابدیت کے خواب دیکھنے لگا تھا وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا ہر صبح جب موت اپنے ترشول لے کر آتی اور برگد کے درخت کے سامنے ترشول پر اپنا سرخ ہاتھ رکھ کر پوچھتی.....چلتا ہے کہ کل آؤں تو جوگی ہنسنے لگتا اور کہتا.....جا اپنا کام کر تو مجھے کیا مارے گی۔''

.....

'رفتہ رفتہ موت کے آنے پر جوگی چھپنے لگا .....ایک روزہ صبح .....جوگی برگد کے پیڑ سے لٹکا ہوا تھا اس نے برگد کی لٹکی جڑ سے پھندا لگا کر جان موت کے سپرد کردی تھی میں اونچی شاخوں سے اترا اور میں نے اسے اس گرہ سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میری چونچ اور پنجے گرہ کھولنے میں مصروف تھے جب اس کے لہو کی پتلی سی دھار میرے حلق میں داخل ہوئی۔

آدم زاد کا لہو۔!

.....اسی وقت میری سرشت بولی آقا!
سوائے انسان کے کوئی موت سے خائف نہیں، پہلی بار میں موت سے ڈرا .....اس روز کے بعد میں اونچے درختوں پر موت سے چھپ کر رہتا ہوں۔ لیکن موت سے میرا رشتہ کچھ ایسے منسلک ہوگیا ہے کہ میرے جسم میں تمام لہو مردار جسم سے بنتا ہے میں موت کا دشمن اور موت کا ہی پروردہ ہوں۔'

(راجہ گدھ۔ص/۳۲۵تا۳۲۶)

پہلے تو مصنفہ راجہ گدھ کی زبانی موت کے فلسفے کو پیش کرتی ہیں اور پھر پروفیسر سہیل کی زبانی قاری کے ذہن سے موت کا ڈر نکالنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ پروفیسر سہیل قیوم کو دیوانہ پن کی وجہ سے چھٹکارا دلانے کی غرض سے اس کے دل و دماغ سے موت کا خوف نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ذہنی سکون اور اس خوف کو دور کرنے کے لیے ایک سائیں جی سے ملواتے ہیں جو روحوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ سائیں جی قیوم کو موت کے راز سمجھاتے ہیں اور ایک دن روحوں سے گفتگو کرتے ہوئے اسی قبر میں دفن ہوجاتے ہیں۔ جہاں وہ یہ کام انجام دیتے تھے۔ یہاں مصنفہ دراصل کبھی پروفیسر سہیل اور کبھی سائیں جی کی زبانی فلسفۂ موت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ ناول سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''انسان کو دنیا میں ایک سب سے بڑی پریشانی ہے قیوم .....وہ پائدار ہونا چاہتا ہے اور موت کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مستقل نہیں ہوسکتا۔ انسان کی ہر پریشانی کا تجربہ کرو اصل میں پریشانی موت سے پیدا ہوتی ہے..... آرزو کی موت راحت وخوشی کی مرگ.....دیکھو تو آدمی ہر وقت مرتا رہتا ہے بدن کی موت تو آخری فل اسٹاپ ہے۔ موت کی جھلکیاں چھوٹی۔ موٹی ملاقات تو روز ہوتی ہے موت۔''

.....

''سائیں جی سے ملوگے تو پتہ چلے گا موت کچھ نہیں ہے.....وہ پردہ اٹھا کر دکھادیں گے کہ کیسے انسان ابدی زندگی پالیتا ہے.....موت نہ ہوتی، موت کا ڈر نہ ہوتا تو آدمی کبھی غم سے آشنا نہ ہوتا.....دیوانہ نہ ہوتا۔''

(راجہ گدھ۔ص/۳۶۸)

اس طرح مصنفہ جس مقصد کے تحت ناول کی ابتدا کرتی ہیں اس کی تلاش موت کے علم پر ختم ہوجاتی ہے۔ اور یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انسان کو موت کا علم نہ ہوتا تو وہ کبھی دیوانہ نہ ہوتا۔ حالانکہ ان کی کسی بھی تھیوری میں اتنا دم نہیں تھا کہ قاری کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرسکیں۔ ساتھ ہی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے بغیر انجام ذہن میں رکھتے ہوئے قصہ کا آغاز کردیا اور جو خیالات ان کے ذہن میں اس سلسلے میں آتے گئے اسے کاغذ پر اتارتی گئیں۔ اور چونکہ قصہ پہلے سے ذہن میں نہیں تیار کیا گیا تھا اس وجہ سے ناول دلچسپی سے خالی نظر آتا ہے۔

کردار بھلے ہی ایک ہی ہوں لیکن بار بار قصہ تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ ساتھ ہی راجہ گدھ کی تمثیل کے ذریعہ بھی مصنفہ قصہ میں نیا پن لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جس میں کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ عرفان کے موضوع پر بھی بحث کرتی ہیں۔ ناول کے آخر میں آفتاب کے بیٹے افراہیم کے کردار کے ذریعہ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ انسانی ذہن کا ایک مقام ایسا بھی ہوتا ہے جب وہ عرفان کی منزل پر پہنچ جاتا ہے لیکن ایک عام انسان ایسے افراد کی ذہنی صلاحیت کو نہیں سمجھ پاتا ہے اور انہیں دیوانہ سمجھنے لگتا ہے۔ مصنفہ ایک بار پھر پروفیسر سہیل کی زبانی اپنی بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ جس طرح رزق حرام انسان میں دیوانگی کے اثرات پیدا کرتا ہے اسی طرح ایک خاص رزق ہوتا ہے جو انسانی ذہن کو عرفان کی منزلوں پر پہنچادیتا ہے۔

ناول کے آخر میں قیوم کی ملاقات آفتاب اور اس کے دس سال کے بیٹے افراہیم سے ہوتی ہے جس کی آنکھیں اس کے چہرے کے حساب سے بہت بڑی ہیں۔ اور جو بے حد کمزور ہے۔ آفتاب قیوم کو بتاتا ہے کہ افراہیم ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا وہ بہت ہی تندرست بچہ تھا لیکن اس کے خوابوں نے اسے پریشان کررکھا ہے۔ اسے عجیب وغریب چیزیں دکھائی دیتی ہیں آدھا آدھا گھنٹہ وہ خلا میں دیکھتا رہتا ہے اور ایسی ایسی چیزوں کے بارے میں بتاتا ہے جو اس نے کبھی نہیں دیکھیں۔ انہیں خوابوں کی وجہ سے وہ دن بدن کمزور ہوتا جارہا ہے۔

آفتاب کو ایسا لگتا ہے کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے جس نے اس کے بیٹے کو دیوانہ بنا دیا ہے لیکن پھر قیوم اسے پروفیسر سہیل سے پڑھا پڑھایا سبق سناتا ہے کہ یہ دیوانہ پن نہیں ہے بلکہ اس کا بیٹا عرفان کی ان منزلوں تک پہنچ گیا ہے جہاں عام تندرست آدمی کا ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ ناول کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مصنفہ ایک ہی بات کو تین مرتبہ پیش کرتی ہیں۔ پہلے پروفیسر سہیل کی زبانی، پھر قیوم کی زبانی اور اس کے بعد راجہ گدھ کی تمثیل کے ذریعہ۔ بہرحال پھر افراہیم بتاتا ہے کہ اسے مدینے کی سڑکوں پر بھاگتے لوگ نظر آرہے ہیں، اذان کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں تو قیوم آفتاب سے پوچھتا ہے کہ کیا افراہیم کبھی مدینے گیا ہے۔ یہ جواب ملنے پر کہ کبھی مدینے نہیں گیا تو قیوم کو یقین ہوجاتا ہے کہ واقعی افراہیم عرفان کی منزل تک پہنچ گیا ہے۔ حالانکہ مصنفہ یہ بات بھول گئیں کہ افراہیم اس دور میں جی رہا ہے جب ٹی۔وی۔(Television) اور اخباروں کا دور ہے۔ اس لیے چاہے کوئی شخص مدینے گیا ہو یا نہ گیا ہو مدینے کی زیارت ضرور کی ہے۔ اور افراہیم جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہ رہا ہے اس کے لیے یہ کون سی بڑی بات ہے۔

ایک بات اور جو قابل غور ہے وہ یہ کہ مصنفہ نے ناول میں جگہ جگہ انسان کے مزاج کو گدھ کے مزاج سے تشبیہ دی ہے جب کہ انہوں نے تمثیل کے ذریعہ یہ بات واضح کی ہے۔ کیونکہ راجہ گدھ کے حلق سے ایک جوگی کا خون اتر گیا تھا اس وجہ سے اس کا مزاج انسانوں کے جیسا ہوگیا وہ انسانوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ اس کے اندر انسانوں جیسے دیوانہ پن کے اثرات نمایاں ہونے لگے تو پھر مصنفہ جگہ جگہ انسانوں کے مزاج کو گدھ تک جاتی کی طرح کیوں بتاتی ہیں۔ ناول سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''میں نے پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا وہ کسان نہیں تھا.....وہ صرف راجہ گدھ تھا جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا۔''

(راجہ گدھ۔ص/۱۶۰)

''میں اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی، جذباتی طور پر صحت مند سمجھ رہا تھا اس وقت مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ راجہ گدھ کی صابی سے کوئی بھی زیادتی وقفے تک صحت مند نہیں رہ سکتا۔ پاگل پن اس پر Quantums میں بڑھتا رہتا ہے۔''

(راجہ گدھ۔ص/۱۷۴)

بھلے ہی مصنفہ اپنے ناول کے موضوع کو پورے طور پر واضح نہیں کرسکیں لیکن یہ ان کی ایک بہترین کوشش کہی جاسکتی ہے۔ مصنفہ کی کردار نگاری بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہے ناول کے سارے کردار محض موضوع کو واضح کرنے کی غرض سے ہیں۔ ان کرداروں کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ پورے ناول میں قیوم اور پروفیسر سہیل کا کردار ہی چھایا نظر آتا ہے ان دونوں کرداروں کی تشکیل مصنفہ نے تجربہ کے طور پر کی ہے۔ قیوم اور پروفیسر سہیل کے کرداروں کو کٹھ پتلی کی طرح اپنی دلیلوں اور نظریات کے حساب سے استعمال کرتی ہیں۔ اپنے گھر والوں سے الگ الگ اور خاموش رہنے والا قیوم ایک موقع پرست اور ذہنی بیماری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ہمیشہ خاموش رہنے والا قیوم جسمانی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے عابدہ کو لمبی لمبی تقریریں کرکے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح سیمی ہو یا امتل ہر جگہ جسمانی تعلقات استوار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار پروفیسر سہیل کا ہے جن کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ مصنفہ اپنی ضرورت کے مطابق ناول میں انہیں لے آتی ہیں اور پھر کام ختم ہوجانے کے بعد وہ غائب ہوجاتے ہیں۔ نہ ہی ایک پروفیسر کی خصوصیت نظر آتی ہے، ان کے مزاج میں کوئی ٹھہراؤ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ بار بار ان کے نظریات بدلتے جاتے ہیں۔ ناول کا مطالعہ کرنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مصنفہ نے بغیر انجام سوچے ناول کی شروعات کردی تھی اسی کا اثر ان کے کرداروں کی پیش کش میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھر کر قاری کے ذہن پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑ سکا۔ پروفیسر سہیل کبھی دیوانہ پن کی وجہ تلاش کرتے ہیں تو کبھی اس دیوانہ پن کا علاج جنسی طاقت کی اہمیت آزمانے کے لیے ہندو Mythology کا سہارا لیتے ہیں اور ان کا مسلمان شاگرد اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اس پر عمل بھی کردیتا ہے۔ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے جنس کا سہارا لینے کی صلاح ناکام ہونے کے بعد وہ ذہنی سکون کے لیے سائیں جی کی پناہ میں جانے کی صلاح دیتے ہیں۔ اور خود اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر روحوں کو بلانے کا طریقہ بھی آزماتے ہیں۔ ایک پروفیسر ہونے کے ناطے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کتابوں میں سکون حاصل کرنے کی صلاح دیں۔ لیکن یہ بات بہت عجیب معلوم دیتی ہے جب وہ قیوم کو بتاتے ہیں کہ انہیں خود کتابوں سے سکون حاصل نہیں ہوا اس لیے وہ روحوں سے گفتگو کرنے والے سائیں جی کی پناہ میں جاتے ہیں اور اسے بھی وہاں جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بہرحال ان خامیوں کے باوجود ''راجہ گدھ'' کی ادبی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ بھلے ہی موضوع پورے طور پر واضح نہ ہوسکا ہو لیکن ان کی زبان اور بہترین اسلوب نگارش کے ساتھ ان کی یہ کوشش اس ناول کو ایک انفرادی اور انوکھے انداز کا ناول قرار دیتی ہے۔

مصنفہ کا دوسرا اہم ناول ''حاصل گھاٹ''

۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا موضوع مصنفہ نے ہجرت کرنے والے افراد کی طرز زندگی کو منتخب کیا ہے۔ ناول کا اہم اور مرکزی کردار ہمایوں فرید کا ہے جو امریکہ میں مقیم اپنی بیٹی ارجمند کے گھر چند دنوں کے لیے آتا ہے۔ اپنی بیٹی کی بالکنی میں بیٹھے بیٹھے اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ یہ ناول ''شعور کی رو'' کی ٹکنیک پر مبنی ہے کبھی وہ امریکہ کی سازشوں کے متعلق سوچتے ہیں جو وہ مسلمان ملکوں کے خلاف کرتے ہیں کبھی امریکی تہذیب اور پاکستانی تہذیب کا موازنہ کرتے ہیں۔ ہمایوں فرید جب امریکہ کے بازاروں میں گھومنے کے دوران وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، زبان ہر چیز کے فرق کو دیکھتے ہیں۔ ہمایوں فرید کی زبانی مصنفہ نے ناول کی ابتدا میں مسلمان ملکوں کے خلاف امریکہ کی سازشوں پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ امریکہ نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے ان مسلمان ملکوں کو آپس میں لڑا دیا جس سے ان کی طاقت ٹوٹ گئی اور امریکہ کی طاقت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے انہیں خیالات کو مصنفہ نے ناول میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجئے:

''۱۹۹۱ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی..... اب امریکہ اور بھی بہادر، بولڈ اور دہشت پسند ہوگیا.....لیکن اندر ہی اندر اسے ایک طاقت کا خوف تھا.....روس کی آدرشی تحریک دم توڑ گئی لیکن اسلام کی طاقت امریکہ کو اندر ہی اندر کہیں سہار رہی تھی.....اگر تمام مسلمان حکومتیں کسی طور پر یکجا ہوجائیں تو پھر یہ اتنی لمبی چوڑی Belt توڑنا یا سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہوتا.....لیکن امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لیے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر ان دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کا دھچکا لگانے والا ہے۔ اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن پر اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی وسائل طے کرا ایسے بیٹھا رہا کہ ہلانا مشکل۔ سوڈان کو دہشت گرد بنا کے خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اسے تباہ کر دیا۔ پاکستان کی حکومتوں میں باہمی تنازعوں کو فروغ دے کر بدنظمی اور بد نظامی میں مبتلا کر کے دولخت کر دیا.....افغانستان کو روس کی آدرشی تحریک ختم کرنے کے لیے استعمال کیا اور بعد ازاں احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔''

(حاصل گھاٹ، ص ۸-۹)

ہمایوں فرید اس بات پر بھی غور وفکر کرتے ہیں کہ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ مسلمان ملک ترقی نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنفہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کی بدحالی کی وجہ یہ تلاش کرتی ہیں کہ مسلمان قوم ترقی اس وجہ سے نہیں کر پا رہی ہے کیونکہ وہ ہر وقت اسی اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں ان کے ہاتھوں ایسا گناہ نہ ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی عذاب میں مبتلا کر دے۔ ساتھ ہی ان نوجوانوں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جو ترقی کی غرض سے اپنے ملک سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ہجرت کر جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے خود اپنا ملک ترقی نہیں کر پاتا۔ جب ہر تعلیم یافتہ نوجوان اپنے ملک سے اس طرح نظر پھیر لے گا تو بھلا خود کا ملک کیسے ترقی کر سکے گا۔ ارجمند اور ان کے ڈاکٹر شوہر کا کردار اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو لوگ پاکستان چھوڑ کر امریکہ آ کر بس جاتے ہیں اور امریکی تہذیب میں اس قدر گھل جاتے ہیں کہ امریکہ کی مصروف زندگی میں ان کے پاس اپنے بچوں تک کے لیے وقت نہیں ہوتا ہے یہاں تک کہ چند دنوں کے لیے آئے ہوئے اپنے والد ہمایوں فرید کے لیے بھی دو گھڑی فرصت کے نہیں ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ نوجوان خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

مصنفہ نے ناول کے ذریعہ ایک اور پیغام ملک کے نوجوانوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ جب اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں کی ترقی کا حصہ بن جائیں گے تو پھر اپنے ملک اپنی قوم کی ترقی کیسے ہوگی۔ مسلمانوں کی پستی اور ناکامی کا ایک سبب انہوں نے ان نوجوانوں کا اپنے ملک سے ہجرت کر لینے کو بھی بتایا ہے اور کافی حد تک یہ خیالات صحیح بھی ہیں۔ جب اپنے ملک کے ہی لوگ اپنے ملک کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے اور سدھارنے کی بجائے چھوڑ کر چلے جائیں گے تو ملک کی ترقی کیسے ہوگی۔

ان خیالات کے علاوہ ہمایوں فرید اپنے بچپن سے جوانی تک کا قصہ اسی بالکنی میں بیٹھ کر شعور کی رو کے ذریعہ قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ ارجمند کے کردار کے ذریعہ مصنفہ ترقی کے اس دور میں ان نوجوانوں کی عکاسی کرتی ہیں جو دوسرے ملکوں میں جا بستے ہیں اور ہمیشہ ایک قسم کی احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کی غرض سے یہ نوجوان انہیں کی تہذیب کو اپنا لیتے ہیں۔ ایسا ہی رہن سہن، پہناوا سبھی کچھ انہیں کے جیسا شروع کر دیتے ہیں کہ کہیں ان امریکی افراد کو پتہ نہ چل جائے کہ یہ پاکستان جیسے کمتر ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نوجوان اپنی تہذیب، رہن، سہن، لباس یہاں تک کہ کھانا پینا سب کچھ بھول کر ان کے رنگ میں ایسا رنگ جاتے ہیں کہ کہیں سے

لوگ انہیں کمتر نہ سمجھیں۔ ہمایوں فرید جب اپنی بیٹی ارجمند سے اپنے ملک کا پہناوا چھوڑنے پر سوال کرتے ہیں تو وہ انہیں خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ مقام ملاحظہ کیجئے:

'ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا.....'

یہ تم نے اپنی شلوار قمیص کیوں چھوڑ دی ارجمند؟.....''

.....

'بات یہ ہے کہ ابو انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔ میں شلوار قمیص میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں.....'

'لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے نہ ارجمند.....'

'ہاں رہتی تو ہے ابو.....لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں، آپ کو کمتر جانتے ہوں تو اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔'

(حاصل گھاٹ۔ص/ ۲۴)

بانو قدسیہ کے ناولوں کا جو خاص وصف ہے وہ ان کی زبان ہے۔ مصنفہ بے حد رواں انداز میں اپنے خیالات کو الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔ جہاں تک اردو کے الفاظ کا ذکر ہے مصنفہ کہیں بھی مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتی ہیں لیکن موجودہ دور کے اشخاص کے مکالمے پیش کرتے ہوئے بعض اوقات انگریزی کے ایسے الفاظ استعمال کر جاتی ہیں جو عام قاری کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں۔ ساتھ ہی انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال بھی مصنفہ کثرت سے کرتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر کردار اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اسی لیے انگریزی الفاظ کا بہ کثرت استعمال ان کے ناول کے اسلوب کو حقیقی رنگ بخشتا ہے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ جس کردار کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے جا رہے ہیں وہ بناوٹی معلوم ہو رہے ہوں بلکہ ان کے کرداروں کی زبانی انگریزی کے الفاظ فطری معلوم ہوتے ہیں۔ ناول سے مثال ملاحظہ کیجئے:

''سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا.....Bastard کہتے.....تم سچ ہو لیکن جب میری ساری بات سنو گے تو شاید اپنی رائے بدل لو گے۔ .....Tranqulizer radiation ہو جاتی ہے اور ایسا ہی کئی دوائیوں سے Quess میں خطرناک Mutation ہو جاتی ہے۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۷۱، علامہ اقبال سائبر لائبریری)

''میرا خیال تھا کہ E.S.P پر کتابیں پڑھنے Wypuosis اور Telepathy Dirvonce کے متعلق پڑھتے رہنے سے مجھے افاقہ ہوگا۔ میں Astral Travel کے پیچھے لگا رہا۔''

(راجہ گدھ، ص/ ۲۴۵، علامہ اقبال سائبر لائبریری)

اس طرح کی مثالوں سے ان کے ناول بھرے پڑے ہیں اور جو ایک کمی ان انگریزی الفاظ کے استعمال کے متعلق نظر آتی ہے وہ یہ کہ مصنفہ ان الفاظ کا استعمال عام قاری کو ذہن میں رکھ کر نہیں کرتی ہیں۔ ناول کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ان کے ناول ایک خاص طبقے کے لیے تصنیف کیے گئے ہیں۔

انگریزی الفاظ کے استعمال کے علاوہ نئے ناول نگاری کی جو خصوصیت ان کے ناولوں میں موجود ہے وہ ہے جدید الفاظ کا استعمال۔ ان کے ناولوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نئی تشبیہات کا استعمال نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ کرتی ہیں جو ان کی ناول نگاری کو ایک منفرد اور انوکھا انداز بخشتا ہے۔ مصنفہ نے موجودہ دور میں رائج الفاظ کے مطابق اپنے ناول کو تشبیہات سے آراستہ کیا ہے۔ انہوں نے اردو ناول کو بے شمار نئی تشبیہات کا تحفہ عطا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

''ساری زمین انڈے کی سفیدی جیسی پھینٹی ہوئی تھی۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۵۲)

''وہ اس طرح کسمسائی جیسے ٹھنڈے پانی کا شاور سردیوں میں اپنے اوپر کھل جائے۔''

(راجہ گدھ، ص/ ۲۲)

''اکتوبر کا دن تھا جس طرح بھٹی سے نکل کر مکئی کے دانے سفید پھولے ہوئے بڑے اور ٹھنڈے نظر آتے ہیں ایسے ہی اکتوبر کا یہ دن تھا۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۲۵)

''آج اس نے اپنی ابرو Pluck نہیں کیے تھے اور چھوٹے چھوٹے نئے بال چیونٹیوں کی سی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۳۰)

''جو کچھ لکھا جاتا وہ اتنا ہی بے ربط تھا جیسے بندروں کا ایک جتھہ ٹائپ رائٹروں پر کتاب لکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۲۵)

اس طرح کی مثالوں سے مصنفہ کے ناول بھرے پڑے ہیں۔ جدید اور انوکھی تشبیہات کے علاوہ مصنفہ نئی لفظیات کا استعمال بھی کرتی ہیں جو ان سے قبل کسی خاتون ناول نگار کے ناولوں میں نظر نہیں آتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہوں:

''میں چپ ہو گیا ..... وہ بہت خطرناک پانیوں میں بغیر لائف سیونگ بلٹ کے تیر رہی تھی۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۳۰)

''کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف مل دی۔''

(راجہ گدھ۔ص/ ۱۵۲)

❑❑❑

انتظار حسین کے افسانوں میں ہجرت کے مسائل

زاہد ندیم احسن

ریسرچ اسکالر

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی

رابطہ: 9870354416

افسانہ وہ آئینہ ہوتا ہے جو زندگی کی بعض گہرائیوں کے انکشاف کے لئے کچھ خاص قسم کے استدلال ٹھوس واقعات اور کرداروں سے مدد لیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ہمیشہ تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے۔ زندگی ہر دور ہر عہد میں سانحات اور انقلابات سے دو چار ہوتی رہتی ہے، تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے اثرات ہمارے افسانے پر نہ پڑیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے افسانوں میں اپنے عہد میں ہونے والے انقلابات اور سانحات کے زیر اثر ہونے والی پریشانیوں کی تصویر نظر آتی ہے۔

برصغیر کا ایک بڑا سانحہ تقسیم ہند تھا جس کے زیر اثر اٹھنے والے فسادات کی غمناکیاں اور بعد ازاں ہجرت کا عمل اور اس کے درپیش پریشانیوں نے اس عہد کے لکھنے والوں کو متاثر کیا جسے اس عہد کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جن افسانہ نگاروں نے ہجرت کے مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا اس میں ایک اہم نام انتظار حسین کا بھی ہے۔ انتظار حسین کا تخلیقی سفر تقسیم ہند کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'قیوما کی دکان' ہے جسے انہوں نے ہجرت کے ٹھیک ایک سال کے بعد لکھا جو رسالہ ادب لطیف میں ۱۹۴۸ میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ انتظار حسین کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں اردو افسانے میں کہانی کی کلاسکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فن افسانہ نگاری کو نئی سمت و رفتار عطا کی۔ ان کے افسانے زندگی کے متعدد شاخشانے سامنے لاتے ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز سے اس قدر مربوط نظر آتے ہیں کہ قاری ان کی جامعیت، کلیت حقیقت اور سحر میں کھو کر ان کی تخلیقی صلاحیت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے کے لئے ایک طرف ہندی کتھاؤں سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف اسلامی تہذیب و روایت کو اپنے افسانوں کی بنیاد بنایا ۔ انہوں نے اردو فکشن کو صرف ایک نیا اسلوب ہی نہیں دیا بلکہ ماضی کے انہی قصے کہانیوں سے حال کے چیزوں کی عکاسی کر لوگوں تک پہنچایا ہے۔ انتظار حسین اپنے فکری نظام کے اس جہت کے حوالے سے، کہانی کہانی میں لکھتے ہیں کیا ضروری ہے کہ آنکھ سے دیکھنے کے بعد ہی بات اپنا تجربہ بنے۔ یہ قدیم ماضی تو ہمارے خون میں شامل ہے۔ ہمارے نسلی شعور کا حصہ ہے'' وہ اپنے افسانوں کے مجموعے'' کچھوے'' میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے مصیبت زدہ زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں، کتنے دن اجودھیا اور کربلا میں مارا مارا پھرتا رہا یہ جاننے کے لئے کہ آدمی بستی چھوڑتے ہیں تو ان کے واپر

کیا بیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کے انتظار حسین کے افسانوں میں ماضی کی بازیافت تسلسل کے ساتھ نظر آتا ہے۔'' ایک جگہ اپنے مضمون اجتماعی تہذیب اور افسانہ میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

''جب تہذیبی سالمیت رخصت ہو چکی ہو تو اجتماعی احساس کا ترجمان بننے کے لئے افسانہ نگار کو بہت جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اسے باطنی زندگی کی گہرائیوں میں یہ دریافت کرنا پڑتا ہے کہ وہ کون سے احساسات، آدرش، تمنائیں اور موروثی شکلیں ہیں جو تہذیبی زندگی اور جذباتی چلن میں تفرقہ پڑ جانے کے باوجود مشترک ہیں او رسماج کے ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ ان مشترکات میں ایک تو ماضی کا ورثہ ہوتا ہے۔ ماضی میں بے شک بے ربطی کا صورت پیدا ہو جائے مگر یہ ورثہ تو یادوں کی صورت میں اجتماعی حافظے میں محفوظ ہے''

(علامتوں کا زوال، ص:۱۷،۱۸)

اس مضمون کا مطمح نظر انتظار حسین کے وہ افسانے ہیں جن میں انہوں نے ہجرت اور اس کے در پیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ انتظار حسین چونکہ خود تقسیم ہند اور ہجرت کے غم سے دو چار ہو چکے تھے ہجرت کی اس تکلیف اور کرب کو محسوس کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں فسادات اور ہجرت کے موضوعات فطری طور پر نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت کا احساس انتظار حسین کو بخوبی تھا اور ان کا اظہار بھی انہوں نے اس طرح کیا ہے: ''ہجرت کا تجربہ ایک نئی آگاہی لے کر آیا تھا یہ کہ آدمی اتنا کچھ نہیں ہوتا جتنا کچھ وہ نظر آتا ہے۔ اس کے رشتے اس کے خارج سے زیادہ اس کے باطن میں پھیلے ہوئے ہیں اور معاشرتی حقیقت خود مختار حقیقت نہیں ہے، وہ بہت سی غائب اور حاضر حقیقتوں، گم شدہ اور نو آمدہ عوامل کے گھال میل سے جنم لیتی ہیں۔ زمانے دو نہیں تین ہیں اور یہ تین زمانے جدا جدا حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ان کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ آدمی حاضر میں سانس لیتا ہے مگر اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوتی ہیں۔'' جن افسانوں میں ان کے ذاتی تجربات و احساسات ملتے ہیں ان میں 'قیوما کی دکان'، 'شہر افسوس'، 'وہ جو کھوئے گئے' 'سیڑھیاں'، 'اجودھیا'، 'سانجھ بھئی چو دیس'، اور 'محل والے' قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا افسانوں میں ہجرت کی غمنا کیاں اور اپنوں سے بچھڑنے کا کرب اور اس کے متعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ انتظار حسین تقسیم ہند کے موقع پر رونما ہوئے انسانی بربریت اور مہاجر کی پریشانیوں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے دیومالا جاتک کتھاؤں اور قصص سے کام لیا ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

''اصل میں ہماری ذات کئی دیومالاؤں کا سنگم ہے۔ قصص و روایات کے مختلف سلسلے یہاں آ کر ملتے ہیں کچھ سلسلے علاقوں اور نسل کے حوالے سے، کچھ سلسلے مذہبی عقائد کے راستے سے اور کچھ سلسلے مذہبی عقائد کے دیس دیس سفر کے واسطے سے''

(علامتوں کا زوال، ص:۲۹،۳۰)

انتظار حسین کا افسانہ ''شہر افسوس'' ہجرت کے انہی مسائل کا عکاس ہے۔ یہ پورا افسانہ علامتی نوعیت کا ہے، ہجرت کے بعد اپنے گھر بار اور اپنے لوگوں کو چھوڑ کر اور اپنا سب کچھ لٹ لٹا کر اچھے مستقبل کی تلاش میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں تو انہیں صرف محرومی ہی محرومی ہاتھ آتی ہے اس کا بیان شہر افسوس میں کچھ اس طرح سے ملتا ہے۔ اس کہانی میں تین آدمی ہیں جو اپنے گھر بار عورتوں اور لڑکیوں کی عزت کو پامال ہوتے ہوئے بھی دیکھتے ہیں اور خود بھی وہی کام کرتے ہے جو ان کے ساتھ گذرتی ہے۔ اور وہ اس کام کو کرنے کے بعد اپنے آپ کو مرا ہوا تسلیم کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان گناہوں سے جو ان سے سرزد ہو گئی تھی اسے چھپانے کے لئے جگہ جگہ بھاگتے پھرتے ہے مگر اسے کہیں سکون نہیں ملتا۔ ایک اقتباس دیکھیں۔

''میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں، اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند رستے سنسان گلیاں ویران۔ کسی کسی مکان کے پٹ اتنے کھلتے کہ دو سہمی سہمی آنکھیں نظر آتیں پھر جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔ عقل حیران تھی کہ کیسا نگر ہے۔ لوگ ہیں مگر گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔ آخر ایک میدان آیا جہاں دیکھا ایک خلقت ڈیرا ڈالے پڑی ہے۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں بڑوں کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ ماؤں کی چھاتیاں سوکھ چکی ہیں۔ شاداب چہرے مرجھا گئے ہیں۔ گوری عورتیں سنولا گئی ہیں۔ میں وہاں پہنچا کہ اے لوگوں کچھ تو بتاؤ یہ کیسی بستی اور اس پہ کیا آفت ٹوٹی ہے کہ گھر قید خانے پڑے ہیں اور گلی کوچوں میں خاک اڑ رہی ہے۔ جواب ملا کہ اے کم نصیب تو شہر افسوس میں ہے۔'' (ص:۲۵۶)

مذکورہ اقتباس کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے ہجرت کے بعد پیش آنے والی پریشانیوں کو افسانہ نگار نے علامتی انداز میں بڑی ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور یہ علامتی انداز زیادہ پیچیدہ بھی نہیں کیوں کے جب ہم ہجرت کے بعد در پیش مسائل اور سانحات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ اقتباس ان تمام چیزوں کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے حالات میں کس طرح سے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے اور انہیں کس کس طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ماؤں نے اپنے بچے گنوائے عورتوں نے اپنی عزت گنوائی اور پھر امن کی تلاش میں جس جگہ آئے بھی تو کیا حاصل ہوا صرف افسوس یا افسانہ نگار کی زبان میں شہر ے افسوس کہہ سکتے ہیں۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے ہجرت کے اس المیہ کو جس

میں لوگ یہ سوچ کر اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے جگہ پناہ لینے کو تیار ہوتے ہیں کہ ہمیں اس جگہ کی پریشانی سے اور صعوبتوں سے نجات ملے گی اور وہ جگہ ہمارے لئے دارالامان ثابت ہوگی۔ لیکن ہجرت کے بعد تمام چیزیں اس کے برعکس نظر آتی ہیں۔ وہ جس جگہ کو چھوڑ کر آئے وہ بھی ان کا نہیں رہتا اور جس جگہ ہجرت کر گئے وہ بھی انہیں قبول نہیں کرتی اس کا بیان افسانے میں کچھ اس طرح ملتا ہے:۔

''میں نے افسوس کیا اور کہا کہ اے بزرگ کیا تو نے دیکھا کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انہیں قبول نہیں کرتی ہے۔''

''میں نے دیکھا اور جانا کہ ہر زمیں ظالم ہے۔''

''جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟''

''ہاں جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالامان بنتی ہے وہ بھی۔ میں نے گیا نام کے نگر میں جنم لیا اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے نروان کسی صورت نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔''

''اور آسمان؟''

آسمان کے تلے ہر چیز باطل ہے

میں نے تامل کیا اور کہا کہ ''یہ سوچنے کی بات ہے''

''سوچ بھی باطل ہے''

''بزرگ سوچ ہی تو انسانیت کی اصل متاع ہے''

وہ دوٹوک بولا ''انسانیت بھی باطل ہے''

پھر حق کیا ہے میں زچ ہو کر ہو چھا۔

حق وہ کیا چیز ہوتی ہے؟

حق میں نے پورے زور اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

اور اس نے سادگی سے کہا کے تم جسے حق سمجھتے ہو وہ بھی باطل ہے''

(ص:۲۵۸،شہر افسوس)

محولہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ تقسیم ملک کے بعد ہونے والے فسادات، اور ان فسادات میں اپنوں کے کھونے کا غم اور ہجرت کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے انسان کا داخلی وجود اور روحانی علیحدگی ،اور تنہائی کا احساس اس افسانے میں چھایا نظر آتا ہے۔

انتظار حسین کا ایک افسانہ ''وہ جو کھوئے گئے'' ہے جس میں انہوں نے ہجرت کے مسائل اور اس نفسیات کو پیش کیا ہے جس سے تارک وطن دو چار تھے۔ اس افسانے میں واقعات کو استعارہ اور علامت کے ذریعہ سے پیش کیا گیا اور مسلمانوں کی ان کہانیوں پر اس کی بنیاد رکھی ہے جس سے مسلمان پہلے بھی دو چار ہو چکے تھے۔ اس کہانی میں چار کردار ہیں ایک تھیلے والا باریش آدمی زخمی سر والا اور ایک نوجوان ۔کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کے زخمی سر والا آدمی درخت سے ٹیک لگائے آنکھ کھولتا اور پوچھتا ہے کہ ہم نکل آئے؟ باریش آدمی کہتا ہے ہم نکل آئے خدا کا شکر ہے ہم سلامت نکل آئے ہیں پھر تھیلے والا آدمی بھی تائید کرتا ہے کہ ہم کم سے کم اپنی جان بچا کر تو نکل آئے پھر زخمی سر والا آدمی ایک ایک آدمی کو گنتا ہے جو لوگ ساتھ تھے ان میں سے ایک آدمی کم ہوتا ہے وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ ایک آدمی ان میں سے کم کیوں ہے سب باری باری سے گنتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں سے واقعی ایک آدمی کم ہے لیکن پھر یکا یک ایک کو خیال آتا ہے کے شائد وہ خود کو گننا بھول گیا۔اس پورے افسانے میں انسان کے وجود کی پہچان کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان جب اپنے گھر بار کو تج کر دوسرے جگہ پناہ گزین ہوا تو اس نے اپنی جان تو بچا لی لیکن اپنی شناخت کھو بیٹھا جو ان کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس میں انسان کی گمشدگی جسمانی نہیں ہے بلکہ یہ گمشدگی اس کہ وجود کی ہے۔ اس میں ان چاروں کا ماضی محو ہو چکا ہے اور وہ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ وہ لوگ کتنے تھے اور کس کس جگہ سے نکل کر آئے تھے۔ایک اقتباس دیکھئے:۔

''کیا ہمیں یاد نہیں'' نوجوان نے سوال کیا کہ ہم چلے تھے تب کتنے تھے''

''اور کہاں سے چلے تھے'' نوجوان نے ٹکرا لگایا۔ باریش آدمی نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ پھر بولا مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں غرناطہ سے نکلا ہوں۔۔۔۔۔۔غرناطہ سے'' ایک دم سے سب چونک پڑے اور باریش آدمی کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ پھر تھیلے والے نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا باریش آدمی سب کے چونک پڑنے پر سٹپٹا گیا تھا اب اس ہنسی سے بالکل ہی سٹپٹا گیا۔ وہ ہنسے جا رہا تھا پھر بولا یہ ایسی باتا ہے کہ میں ہانکنے لگوں کہ جب میں جہاں آباد سے نکلا ہوں تو۔۔۔ جہاں آباد سے سب چونک پڑے تھیلے والا خود بھی کہ ابھی تک باریش آدمی پر ہنسے جا رہا تھا

''سیڑھیاں'' انتظار حسین کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ہجرت کے مسائل کو مذکورہ افسانوں سے کچھ الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں چار کردار بشیر بھائی، اختر، رضی اور اور سید ہیں۔ یہ چاروں ایک دوسرے کو اپنا اپنا خواب سناتے ہیں اس میں سید ایسا کردار ہے جس کو خواب نہیں آتے۔ لیکن ہجرت سے پہلے اسے بھی خواب آتے تھے۔ اور اسی خواب اور ان خوابوں کے درمیان گفتگو سے انتظار حسین نے مہاجرین کے ان تمام مسائل کو پیش کیا ہے جو ہجرت کرنے والوں کو درپیش تھے۔ ہجرت ایک ایسا عمل ہے جس سے لوگوں کی صرف خارجی حالات ہی نہیں بدلتے بلکہ ان کی داخلی کیفیت بھی مجروح ہوتی ہے اور ایسی ہجرت جو ان کا اپنا فیصلہ بھی نہیں ہوتا وہ تو انہیں ایک nostalgic کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔

سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔ تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسا'' میں اکھڑ چکا ہوں اب میرے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس اور یا کشمیر سے..... کہتے کہتے رکا۔

محولہ بالا اقتباس میں مسلمانوں کی اس تاریخی جلا وطنی بیت المقدس، کشمیر اور جہاں آباد غرناطہ، کی طرف اشارہ ہے جہاں سے یہ ہجرت کر کے آئے تھے چونکہ انتظار حسین حال کی بازیافت ماضی کے واقعات سے کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ماضی جامد نہیں ایک نامیاتی طاقت ہے'' اس کہانی میں بھی انہوں نے اسی کا سہارا لیا ہے وہ اس سلسلے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''ہجرت مسلمان قوم کی تاریخ میں ایک ایسے تجربے کا مرتبہ رکھتی ہے جو بار بار اپنے آپ کو دہراتا ہے اور خارجی اور باطنی دکھ درد کے لمبے عمل کے ساتھ ایک تخلیقی تجربہ بن جاتا ہے۔''

''جب اجتماعی زندگی میں کوئی ایسا تجربہ اپنے آپ کو دہراتا ہے جس نے بار بار ظہور کیا ہو اور جو اجتماعی شعور کا حصہ بن چکا ہو تو اس سے پیدا ہونے والے استعارے عہد کے تجربے کے ساتھ ساتھ پرانے زمانوں کے ساتھ بھی رشتہ قائم کر دیا کرتے ہیں۔''

(علامتوں کا زوال، ص:۹۶، ۹۴)

اس طرح ہم اس کہانی میں دیکھتے ہیں کہ چاروں کردار جو کہ ہجرت کر کہ سکون اور دارالامان کی تلاش میں اپنی اپنی عذاب والی جگہ سے باہر تو نکل آتے ہیں لیکن یہ اپنی ہی بازیافت نہیں کر پاتے۔ انتظار حسین ان چاروں کی بازیابی کو ان علاقوں سے جوڑ دیتے ہیں جو تاریخی اہمیت کا حامل ہیں اور اس کی وضاحت مذکورہ بالا اقتباس میں بھی ملتی ہے کہ کوئی بھی واقعہ جب کسی تاریخی واقعہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں یا اسے کسی تاریخی واقعہ سے جوڑتے ہیں تو اس کی حیثیت کسی ایک جگہ سے نہ ہو کر آفاقی ہو جاتی ہے اس کہانی کے کردار کی حالت سے افسانہ نگار نے بھی وہی کام لیا ہے کہ جن لوگوں نے ہجرت کی اور اچھے مستقبل کی تلاش میں نکلے ان کی حالت بھی مذکورہ افسانہ کے کرداروں کی سی ہو گئی۔

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

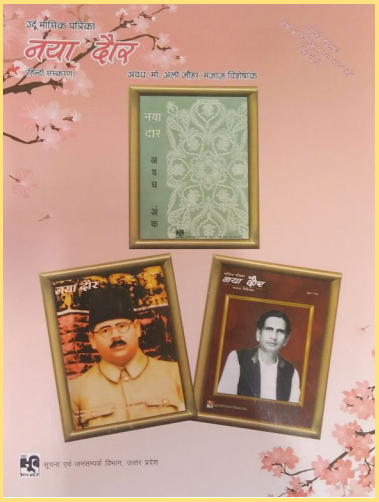

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

''سیڑھیاں'' انتظار حسین کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ہجرت کے مسائل کو مذکورہ افسانوں سے کچھ الگ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں چار کردار بشیر بھائی، اختر، رضی اور اور سید ہیں۔ یہ چاروں ایک دوسرے کو اپنا اپنا خواب سناتے ہیں اس میں سید ایسا کردار ہے جس کو خواب نہیں آتے۔ لیکن ہجرت سے پہلے اسے بھی خواب آتے تھے۔ اور اسی خواب اور ان خوابوں کے درمیان گفتگو سے انتظار حسین نے مہاجرین کے ان تمام مسائل کو پیش کیا ہے جو ہجرت کرنے والوں کو درپیش تھے۔ ہجرت ایک ایسا عمل ہے جس سے لوگوں کی صرف خارجی حالات ہی نہیں بدلتے بلکہ ان کی داخلی کیفیت بھی مجروح ہوتی ہے اور ایسی ہجرت جو ان کا اپنا فیصلہ بھی نہیں ہوتا وہ تو انہیں ایک nostalgic کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے اس پورے افسانے میں میں خواب بھی یاداشت بنکر اور یاداشت خواب بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس پورے المناک مناظر کو سامنے لاتا ہے جس کا شکار یہ چاروں مہاجرین ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے: محمد عمر میمن کا مضمون' حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت کا یہ اقتباس دیکھیں:

''یہاں دراصل سارا معاملہ ایک خاص الخاص نسبت کا ہے جو' خواب' کو 'یاداشت' اور 'یاداشت' کو 'خواب' سے ہے۔ خواب ہی فی الواقع یاداشت کی بازیافت کا واحد ذریعہ ہے۔ خواب دیکھنے کا خلقی صلاحیت کا فقدان اور اشارہ یا مقدار اً یاداشت کا گم ہو جانا شخصیت کی موت ہے خواہ یہ عمل انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر''

مذکورہ بالا افسانوں کے جائزے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین کے افسانے تقسیم ملک، ہجرت، تہذیبی بحران، ثقافتی انتشار اور اخلاقی اقدار کے زوال کا نوحہ ہیں۔

❑❑❑

عابد سہیل بحیثیت خاکہ نگار

گلزار حسن

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو فارسی

ڈاکٹر ہری سنگھ گور سینٹرل یونیورسٹی

ساگر

رابطہ: 9795758606

اردو ادب میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ہوا۔ انگریزی میں اس صنف کے لیے PEN PORTRAIT SKETCH، وغیرہ اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ لیکن اردو میں SKETCH کے لیے موزوں ترین لفظ خاکہ ہے کیونکہ اس کی مکمل ترجمانی اسی لفظ کے ذریعے ہی ہوتی ہے، حالانکہ اردو میں بھی SKETCH یا PEN PORTRAIT کے لیے خاکہ کے علاوہ چند اور اصطلاحیں بھی مروج رہی ہیں مثلاً 'مرقع'، 'قلمی مرقع'، 'شخصی مرقع' وغیرہ لیکن ان میں خاکہ ہی سب سے مناسب ہے۔ اس سلسلے میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''اسکیچ کے لیے اردو میں ''خاکہ نگاری''، ''مرقع''، ''قلمی تصویر'' وغیرہ اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں خاکہ سب سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اسکیچ (SKETCH) کا پورا مفہوم اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے۔''(۱)

خاکہ نگاری کا تعلق براہ راست شخصیت سے ہے۔ مختصر الفاظ میں اگر خاکہ کی تعریف بیان کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ، خاکہ صفحہ قرطاس پر قلم فکر سے کسی محبوب شخصیت کی تصویر کھینچنے کا نام ہے۔ اس میں خاکہ نگار اپنے ذاتی تاثرات اور متعلقہ شخصیت کے ساتھ پیش آئے ہوئے اہم واقعات کا سہارا لیتا ہے اور اپنی فن کاری سے ایسی جاگتی تصویر بناتا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس سے بالکل آشنا خیال کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی نظر میں:

''خاکہ صفحہ قرطاس پر نوک قلم سے بنائی ہوئی ایک شبیہ ہے۔ یہ بے جان ساکت اور گم سم نہیں ہوتی۔ یہ بولتی ہوئی متحرک پر کیف تصویر ہوتی ہے۔ ایک مصور یا بت تراش کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکر میں کسی دل پذیر تہور کی جھلک بھی دے دے مگر ایسی تصویر بنانا، بت تراش یا فوٹو گرافر کے بس سے باہر ہے جسے دیکھ کر ہم فرد کی سیرت اور انفرادیت کا بھی اندازہ کریں۔''(۲)

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا کہ اردو ادب میں موجودہ خاکہ نگاری کا تصور مغرب کا رہین منت ہے۔ انگریزی ادب میں خاکہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے، لیکن اردو ادب میں اس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے ربع اول میں انگریزی ادب کے زیر اثر ہی ہوا۔ عام طور پر اردو میں خاکہ نگاری کی

روایت کے تعلق سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اردو میں اس کا سرمایہ بہت قلیل اور حقیر ہے۔اردو میں اپنی عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو میں خاکوں کا سرمایہ اتنا قلیل نہیں ہے جتنا خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ ڈاکٹر انیس صدیقی (مرتب، خاکہ نگاری: اردو ادب میں) کی جدید تحقیق کے مطابق اب تک خاکوں کے سات سو (۷۰۰) سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اب جہاں تک سوال اس کے حقیر ہونے کا ہے تو بقول نثار احمد فاروقی:

''اردو میں خاکہ نگاری کا ایک وسیع میدان ہے اور اس موضوع پر ہمارا سرمایہ کچھ اتنا حقیر اور کمتر نہیں کہ سرسری طور سے اس کا جائزہ لیا جاسکے۔''(۳)

اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے ربع اول میں ہوا،لیکن اس سے پہلے بھی اردو میں خاکہ نگاری کے نقوش ہمیں جا بہ جا نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں شعرائے اردو کے تذکرے اولیت کا درجہ رکھتے ہیں،جن میں شاعروں کی شخصیت اور سیرت کا عکس نظر آتا ہے۔یوں تو ان میں شخصیت کا حال بیان کرنے سے زیادہ زور انتخاب کلام پر دیا جاتا تھا لیکن کچھ تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں اس دور کے شعرا کی شخصیت اور سیرت کے تعلق سے کچھ جملے ملتے ہیں ،جنہیں خاکہ نگاری کے اولین نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔محمد حسین آزاد تذکرہ نگاروں پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے مختلف شعرا کا حلیہ، عادات و اطوار اور شخصیت کے مثبت و منفی پہلوؤں پر اپنے طور روشنی ڈالی ہے لیکن خاکہ کا مقصد صرف شخصیت کے تعلق سے معلومات حاصل کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ تخیل اور تخلیقی قوت کی مدد سے ان میں ایک نئی روح پھونکنا ضروری ہے۔

محمد حسین آزاد کے علاوہ اس دور میں عبدالحلیم شرر،مرزا محمد ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں خاکہ کے نقوش ملتے ہیں۔اکثر محققین و ناقدین نے اردو کا پہلا باقاعدہ خاکہ نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کو تسلیم کیا ہے ۴؎ اس کے بعد اس کارواں کو آگے بڑھانے میں آحید رحسن،مولوی عبدالحق،محمد شفیع دہلوی ،خواجہ غلام السیدین،عبدالماجد دریابادی اور رشید احمد صدیقی نے کلاسیکی طرز اسلوب کے پیرائے میں شاہکار خاکے تخلیق کیے۔اس کے بعد آنے والے دور میں نئے ادبی رجحانات کے تحت ابھرنے والے نئے تخلیق کاروں نے مغرب کی طرز پر اردو میں خاکہ نگاری کے کاروں کو ایک نئی منزل پہ پہنچاتے ہیں اس سلسلے میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتون، شوکت تھانوی، مالک رام، اعجاز حسین ، چراغ حسن حسرت، غلام احمد فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری، محمد طفیل، عبدالمجید سالک، شاہد احمد دہلوی، نریش کمار شاد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔بیسویں اور اکیسویں صدی دونوں کو ضم کر کے دیکھیں تو لاتعداد خاکہ نگار ہیں جنہوں نے اس صنف کو وقار بخشا ہے۔ان میں شمیم حنفی، اسلم فرخی، آل احمد سرور ،انیس قدوائی، مجتبیٰ حسین، انور ظہیر، نیر مسعود، ندا فاضلی اور عابد سہیل وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

عابد سہیل اردو ادب میں بنیادی طور پر افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن انھوں نے دیگر علمی و ادبی میدان میں بھی اپنے فکر و فن کے جوہر دکھائے ہیں۔حقیقت یہ کہ عابد سہیل ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت افسانہ نگار، صحافی، نقاد، مترجم اور خاکہ نگار بھی تھے۔خاکہ نگاری کی جانب انھوں نے توجہ بعد میں کی پھر بھی ان کے تحریر کردہ خاکوں کے دو مجموعے بالترتیب 'کھلی کتاب' (۲۰۰۴ء) اور 'پورے، آدھے ادھورے' (۲۰۱۵ء) شائع ہو چکے ہیں۔ان دونوں مجموعوں میں کل ملا کر ۴۰ خاکے شامل ہیں جن میں سے ایک کافی ہاؤس اور ایک ماہنامہ کتاب کے متعلق خاکے شامل ہیں۔یہ چالیس خاکے اردو خاکہ نگاری میں عابد سہیل کی اہمیت اور قدر قیمت کا احساس دلانے کو کافی ہیں۔ان دونوں مجموعوں میں عابد سہیل نے جن شخصیات کا خاکہ پیش کیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں۔ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری ،ایم چلپت راؤ (ایم۔سی) آل احمد سرور، پنڈت آنند نرائن ملا، عشرت علی صدیقی، عابد پیشاوری، وجاہت علی سندیلوی، منظر سلیم، احمد جمال پاشا، مقبول احمد لاری ،ڈاکٹر عبدالحلیم، راجیش شرما، نسیم انہونوی، احسن فاروقی ،اسرارالحق مجاز، اودھ کشور سرن، خواجہ محمد رائق، خواجہ محمد فائق، رام مورتی لمبا، سید سبط محمد نقوی، سریندر کمار مہرا، سلامت علی مہدی، سید احتشام حسین، سیوا رام شرما، شمس الرحمن فاروقی، شوکت صدیقی، صباح الدین عمر، صلاح الدین عثمانی، عرفان صدیقی، قمر رئیس، قیصر تمکین، کیفی اعظمی، محمد حسن، مسعود حسن رضوی ادیب، نند کشور دیوراج، نیر مسعود اور ہری کرشن گوڑ۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عابد سہیل کے خاکوں میں شخصیت کی مرقع کشی کے پس پردہ اس دور کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔عابد سہیل نے اپنے خاکوں میں تہذیبی قدروں ،ادبی، سیاسی اور سماجی صورت حال کو فنکارانہ طور پر اس طرح بیان کیا ہے کہ نصف صدی کی روح ان کے خاکوں میں سمٹ آئی ہے اور یہ خاکے کسی مخصوص شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر کے علاوہ اس عہد کا منظر نامہ بھی پیش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندوستان کی وہ تہذیب نظر آتی ہے جس میں بڑوں کی عزت اور حرمت کا ایک قوی تصور موجود ہے۔ایم چلپت راؤ کے خاکہ کے ایک اقتباس میں عابد سہیل نے یہی دکھانے کی کوشش کی ہے:

''جی چاہا کہ آتش نمرود میں، بے خطر ممکن نہ ہو تو دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہی سہی، ایک بار کود کے تو دیکھوں، خود کو مجتمع کیا، آگے بڑھا لیکن ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا اور خشک میووں کے

قریب پایا اور ایک جام جو کسی ایک آتشہ یا دو آتشہ سے تقریباً لبریز تھا، اٹھا ہی لیا دوسروں کی دیکھا دیکھی اس میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے اور ایک ایسی جگہ جہاں بھیڑ ذرا کم تھی خود کو خود سے چھپائے ہوئے جا کھڑا ہوا اور دو تین چسکیاں لیں۔ ہلکی سی کڑواہٹ، جو ناگوار ہرگز نہ تھی، ایک اجنبی سی بو اور لذت کے احساس نے ذرا کی ذرا میں شرابور کر دیا لیکن اس محفل کی فضا کا دخل بھی کچھ نہ تھا۔۔۔اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ پاس کا ایک کھمبا، جو ہے تو دوسرے کھمبوں کی طرح بے حد خوبصورت، ان سے کسی قدر چوڑا تھا، معلوم ہو رہا ہے۔ اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے میں اس طرف بڑھا تو پاس جا کر ہوش ہی اڑ گئے۔ کھمبے سے ٹیک لگائے اور گلاس ہاتھ میں لیے ایم سی کھڑے تھے۔'' (۵)

فن اور تکنیک کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خاکہ کے پانچ فنی لوازم ہیں۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری، اختصار، منظر نگاری اور وحدت تاثر۔ چونکہ عابد سہیل ایک کامیاب افسانہ نگار تھے اس لیے تکنیک کے لحاظ سے بھی عابد سہیل کے خاکے ندرت کے حامل ہیں۔ عام طور پر خاکوں میں تجربات کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ تر افسانوی ادب کی طرح بیانیہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جس میں سیدھے سپاٹ انداز میں خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کے تعلق سے اپنے جذبات احساسات، تجربات، صحبتیں، عادات واطوار، حلیہ، رہن سہن، محاسن ومعائب وغیرہ بیان کر دیتا ہے۔ چند خاکہ نگار ہیں جنھوں نے تکنیک کی سطح پر کچھ تجربات کئے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو اور محمد طفیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ منٹو نے اپنے خاکوں میں سسپنس کی تکنیک استعمال کی ہے اور محمد طفیل نے ڈرامائیت کا سہارا لیا۔ عابد سہیل کے خاکوں میں افسانوی تکنیک کے ساتھ ساتھ سسپنس کا استعمال بھی جا بہ جا نظر آتا ہے۔

افسانوی تکنیک کا استعمال خاکوں میں قصہ پن لانے اور تاثر کے رنگ کو گہرا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس مخصوص تکنیک کے التزام کے لیے خاص فنی بصیرت درکار ہوتی ہے، جس کی مدد سے فن کار اپنے فن میں اثر انگیزی پیدا کرتا ہے۔ عابد سہیل اس فن سے پوری طرح واقف ہیں، وہ کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ فسانہ کو حقیقت اور حقیقت کو فسانہ بنانا وہ بخوبی جانتے ہیں۔ عابد سہیل اس مخصوص تکنیک کا استعمال کبھی خاکے کی ابتدا میں کرتے ہیں اور کبھی آخر میں۔ ایم چلپت راؤ کے خاکے میں ان کے آخری لمحات کی تصویر کشی بڑے خوبصورت افسانوی انداز میں کی ہے:

''دہلی کی کسی سڑک کے کنارے ایک معمولی سے ڈھابے میں ۲۶/ مارچ ۱۹۸۳ء کو ایک لمبا چوڑا شخص داخل ہوا، بنچ پر بیٹھ کر اس نے چائے مانگی، ذرا سی دیر میں چائے آ گئی تو دو تین چسکیاں لیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھابے کا ملازم پیالی اٹھانے آیا تو اس میں آدھی سے زیادہ چائے باقی تھی۔ لیکن چائے پینے والا جا چکا تھا۔۔۔اس ڈھابے میں یا آس پاس کوئی ایسا نہ تھا جو انھیں پہچانتا ہو۔ کچھ لوگوں نے مل کر یہ بھاری بھرکم جسم ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ پولیس آ گئی، اس کے پاس بھی کوئی شناخت کا ذریعہ نہ تھا انھیں پہچاننے والا کوئی مخبر، شرفا، پڑھے لکھے اور اقدار کے پاسبانوں سے پولیس کو کیا واسطہ۔ تھوڑی دیر کے بعد اخبار کے دفتروں کے تار کھڑکھڑائے، فوٹو گرافر آ گئے۔ ان میں بھی کوئی ایسا نہ تھا، جو ان کو پہچانتا ہو۔ آخر ایک سینئر رپورٹر نے انھیں پہچان لیا۔

یہ ایم چلپت راؤ تھے۔

ایک پتہ نہ کھڑکا، ایک نوجوان صحافی کی آنکھ نم نہ ہوئی۔'' (۵)

افسانوی تکنیک کے علاوہ عابد سہیل کے یہاں سسپنس کی تکنیک بھی ملتی ہے۔ عابد سہیل نے اس تکنیک کا استعمال مقبول احمد لاری کے خاکہ میں کیا ہے۔ موصوف اپنے ادبی سفر کے اولین دور میں ہی جاسوسی ناولوں کے ترجمے کر چکے تھے۔ اس لیے وہ اس ہنر سے بخوبی واقف تھے کہ کس طرح قاری کے تجسس کو برقرار رکھا جائے۔ اس خاکے کا نصف حصہ ختم ہو جانے کے باوجود قاری کا تجسس برقرار رہتا ہے کہ مصنف کو موضوع خاکہ پر مضمون لکھنے سے اس قدر احتراز کیوں تھا۔ آخر احمد لاری کی شخصیت میں کون سا نقص ہے۔ خاکہ کے اختتام تک پہنچ کر یہ عیاں ہوتا ہے کہ سیاہ وسفید کی آمیزش مختلف شخصیتوں میں مختلف تناسب میں کیسے شبہات وغلط فہمیاں پیدا کرتی ہے اور بعض دفعہ شخصیتوں کا تضاد کس طرح مضبوط انسانی رشتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ عابد سہیل نے اپنی فنی آگہی اور تخلیقی بصیرت سے ان دونوں تکنیکوں کو اپنے خاکوں میں اس طرح فن کاری سے برتا ہے کہ ان میں معنویت، گہرائی وگیرائی اور بھرپور تاثر پیدا ہو گیا ہے۔

عابد سہیل نے اردو خاکہ نگاری میں ایک نیا تجربہ کیا۔ انھوں نے غیر مرئی اشیا کو ایک شخصیت کا روپ عطا کیا۔ اس سلسلے میں ان کے دو خاکے قابل ذکر ہیں ایک 'اولڈ انڈیا کافی ہاؤس' اور 'ماہنامہ کتاب' ان دونوں کے خاکے تخلیق کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب اور اولڈ انڈیا کافی ہاؤس میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی تشکیل میں دونوں کا حصہ کم وبیش یکساں ہے اور ''پورے، آدھے ادھورے'' میں اس کہانی کی شمولیت کا جواز بھی یہی ہے۔'' (۷)

اولڈ انڈیا کافی ہاؤس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یادش بخیر حضرت گنج کے ''اولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' کی بھی اپنی ایک شخصیت تھی...خاموش، پرسکون...لیکن سیاست، صحافت اور فنون لطیفہ کے میدانوں میں زمین وآسمان اوپر تلے کرنے

والوں کی آماجگاہ۔اس سے اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیتیں متعلق تھیں اور بہت سوں کو اس نے ان دیو قامت شخصیتوں کے فیض سے ہی اپنی پہچان بھی دی تھی ۔خاکوں کے اس مجموعے میں ''اولڈ انڈیا کافی ہاؤس'' پر مضمون کی شمولیت کا یہی جواز ہے۔''(۸)

خاکہ نگاری اختصار کا فن ہے یعنی کم الفاظ میں زیادہ بات کہنی ہوتی ہے ۔اس میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔یہاں کم سے کم واقعات اور کم سے کم الفاظ میں شخصیت کی پوری تصویر پیش کی جاتی ہے۔خاکہ نگار اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ شخصیت سے متعلق تمام خاص و اہم پہلوؤں کو مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کردے۔ایک اچھے خاکہ میں کفایت کا یہ عمل زبان کے علاوہ خاکہ کے جملہ اجزائے ترکیبی میں نمایاں رہتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عابد سہیل کے خاکے اہمیت کے حامل ہیں ۔واقعات کے انتخاب میں انھوں نے ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے اور چند واقعات کے ذریعے شخصیت کی مکمل تصویر کشی کر دی ہے۔ان کے تمام خاکے اتنے مختصر ہیں کہ انھیں ایک نشست میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔اختصار اور جامعیت عابد سہیل کی تحریر کا حسن ہے۔وہ اپنے خاکوں میں ایک کارٹونسٹ کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے موضوع شخصیت کی پر اثر اور دلچسپ اسکیچ پیش کرتے ہیں۔حیات اللہ انصاری کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں تقریباً شخصیت کے پورے نقوش ابھر کر سامنے آگئے ہیں:

''ایک ماہر تیراک، گھڑوں، مٹکوں اور آستینوں میں سانپ پالنے کے شوقین ،ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے برسوں سرگرداں رہنے والے، بین الاقوامی فلم میلہ کے پہلے انعام کی مستحق قرار دی جانے والی فلم کے کہانی کار(کینس فلم میلہ ،فلم نیچا نگر، کہانی حیات اللہ انصاری، پرووڈیوسر چیتن آنند)صف اول کے صحافی ، ناول نگار اور افسانہ نویس اور اپنے خوابوں کو سرد منطق سے بکھیر دینے والے حیات اللہ انصاری ایک مجموعہ اضداد شخصیت کے مالک ہیں۔''(۹)

اس میں زبان سب سے اہم رول ادا کرتی ہے۔زبان کے وسیلے سے ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کی صورت، سیرت، لباس، رہن سہن، انداز گفتگو، محاسن و معائب، جذبات و احساسات غرض شخصیت اور زندگی کے تمام پہلو بیان کرتا ہے۔اسی وجہ سے خاکہ نگار کو زبان پر قدرت ہونا لازمی ہے۔عابد سہیل کی ادبی زندگی لکھنؤ کی آب وہوا میں پروان چڑھی تھی لہٰذا الفاظ کے استعمال پر انہیں قدرت حاصل تھی۔عابد سہیل کی زبان عام طور پر سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔اس میں ایک طرح کا تسلسل ہے جو سیل بے پناہ کی مانند ان کی تحریروں میں رواں دواں ہے۔مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''عشرت صاحب شاعری نہیں کرتے ،افسانے نہیں لکھتے ،پیراکی سے انھیں شوق نہیں ، سیاست میں ان کی دلچسپی صرف ڈاکٹر سدھو تک ہے۔اور مولوی وہ ہیں نہیں، چنانچہ بس وہ ہیں اور صحافت ،صحافت ہے اور وہ۔ان کا اور صحافت کا معاملہ، پانچ وقت کے نماز کے علاوہ ''من تو شدم ،تو من شدی'' والا ہے۔''(۱۰)

عابد سہیل نے اپنے خاکوں کو دلچسپ بنانے کے لیے اشعار، محاورے ،تشبیہات و استعارات اور دیگر زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کیا ہے:

''کھانے پینے کے معاملے میں عشرت صاحب اور حیات اللہ صاحب یعنی ''قدس' اور ''روح القدس'' کی عادتیں بڑی حد تک ایک سی تھیں۔دن کا کھانا دونوں نہیں کھاتے تھے حیات اللہ صاحب یہ کمی چھاج سے پوری کرتے تھے ،عشرت صاحب چھاج پھوک پھوک کر بھی نہیں پیتے تھے۔''(۱۱)

مختصر یہ کہ عابد سہیل کے خاکوں کی زبان میں شگفتگی ،شائستگی ، شوخی ،سنجیدگی ، لطافت ،سادگی ،اثر آفرینی اور معنی خیزی بدرجہ اتم موجود ہے۔

عابد سہیل کے دور میں جن فن کاروں نے

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

خاکے کی طرف توجہ کی وہ ایک دوسرے سے متاثر نظر نہیں آتے۔ان سب کی اپنی اپنی شناخت ہے۔سبھی نے اپنے اپنے میدان متعین کر لیے تھے مثال کے طور پر مجتبیٰ حسین نے مزاح نگاری کو خاکے میں سمونے کی روایت کو آگے بڑھایا نیر مسعود نے علمی شخصیات کا خاکہ عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ندا فاضلی نے اپنی ملاقاتوں کو 'ملاقاتیں' کی شکل دی ہے۔عابد سہیل کی خاکہ نگاری کی جانب بہت کم اکابرین نے توجہ کی ہے۔ان کی خاکہ نگاری پر اگر اکابرین کی رائے تلاش کریں تو تبصروں سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا۔ہاں ان کی افسانہ نگاری اور شخصیت کے تعلق سے مضامین ضرور ملتے ہیں۔پھر بھی ہر بڑا فن کار اپنے فن کے جادو سے اپنے ہم عصروں کو اپنی جانب متوجہ کر ہی لیتا ہے۔لہٰذا عابد سہیل کے خاکوں کے پہلے مجموعے 'کھلی کتاب' کے تعلق سے پروفیسر محمد حسن اس طرح رقم طراز ہیں:

''کھلی کتاب' میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ لکھا ہے، ایک آدھ جگہ عقیدت کا رنگ کچھ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔لازم تو یہ تھا کہ ان سے آسکر وائلڈ کے لفظوں میں یہ مطالبہ کیا جاتا کہ اگر کسی چہرے کی ایک شکن کی عکاسی نظر انداز ہو گئی ہو تو تم سے مواخذہ ہوگا اور تم دامن گیر ہو گے۔بہر حال انھوں نے شرفا کا دستور بھی بڑی استقامت سے نبھایا ہے۔ان کی جگہ کوئی اور ہوتا اور اتنے اور ایسے مختلف نوعیتوں کے جاننے والوں کے بارے میں لکھتا تو کبھی کا پھانسی پا گیا ہوتا۔''(۱۲)

مصحف اقبال توصیفی کھلی کتاب کی ادبی و تاریخی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس 'کھلی کتاب' میں تقریباً نصف صدی کا لکھنؤ اپنی تمام تر ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ترقی پسند تحریک کے عروج کا وہ دور جس کا ایک اہم مرکز لکھنؤ تھا وہ بھی اس میں روشن ہے۔آج کے سیاسی حالات میں جب کہ امریکہ کی جارحانہ پالیسی کے پیش نظر بعض ادبی حلقوں میں تو پھر ترقی پسندی کے احیا کی بات چھڑ رہی ہے اس کتاب کے بارے میں دلچسپی اور اس کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔''(۱۳)

نقوش ایام

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔انہیں میں سے ایک 'نقوش ایام نمبر' بھی شامل ہے۔ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔اسکی قیمت ۲۰۰/ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۱۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۳۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔ ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

اب تک کے مطالعے کو نظر میں رکھیں تو یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ عابد سہیل اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے فکر و فن سے اردو خاکہ نگاری کو نئے افق سے آشنا کیا ہے۔انھوں نے خاکے کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کے میدان میں نئے تجربات بھی کئے۔غیر جانبداری سے اپنی تہذیب کا پاس رکھتے ہوئے انھوں نے شخصیات کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو نظر میں رکھا۔مختصر یہ کہ عابد سہیل بحیثیت خاکہ نگار نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ اردو ادب میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ دیدو در یافت، نثار احمد فاروقی، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۔۱۸

۲۔ ادبی محاکے، ڈاکٹر احمد امتیاز، اردو محل پبلکیشن، دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵

۳۔ اردو میں خاکہ نگاری، نثار احمد فاروقی، مشمولہ خاکہ نگاری۔اردو ادب میں، ڈاکٹر انیس صدیقی، عرشیہ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱

۴۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری، صابر سعید، مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد، ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۳

۵۔ کھلی کتاب، عابد سہیل، کاکوری پریس لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص ۶۷۔۶۸

۶۔ پورے، آدھے ادھورے، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۸۔ کھلی کتاب، مصحف اقبال توصیفی، مشمولہ شعر و حکمت، ۲۰۰۵ء دور سوم کتاب ۷، ص ۱۹۹

۹۔ کھلی کتاب، عابد سہیل، کاکوری پریس لکھنؤ، ۱۴۲ء ۲۰۰۴۔۱۴۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۲۔ دو مختصر مضامین، پروفیسر محمد حسن، مشمولہ ماہنامہ، امکان، ص ۴۴

۱۳۔ کھلی کتاب، مصحف اقبال توصیفی، مشمولہ شعر و حکمت، ۲۰۰۵ء دور سوم کتاب ۷، ص ۱۹۹

❑❑❑

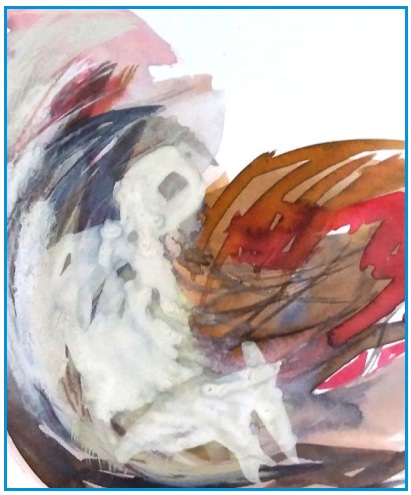

میں وہی ہوں

عطیہ پروین

نیا مکان، قصبہ سید پور

تحصیل رودولی

فیض آباد

رابطہ: 9696783987

میں وہی ہوں۔

''آئے ہے بڑی خیر ہوئی انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔''

کفایت بیگم ہانپتے ہوئے بڑبڑائیں۔اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو.....وہ لرز گئیں۔

پھر وہ اس گھڑی کو کوسنے لگیں جب گھر سے نکلی تھیں ذرا سا کام تھا بس یہ نکڑ کے پنواڑی کی دوکان سے پان لینا تھے۔صبح بچوں سے پان منگوانا بھول گئی بس مصیبت میں پھنس گئی، بڑے ٹھاٹ سے نکلی تھی۔سر پر ساری کا پلو اوڑھ کر بڑی بہو کا دیا ہوا کالے رنگ کا بڑا سا پرس کندھے پر لٹکا کر منجھلی بہو کی ہائی ہیل کی سینڈل پہن کر سنجھلی بہو کا کالا چشمہ لگا کر کہ آنکھیں دھوپ سے بچ جائیں۔ہائی ہیل میں کئی بار گرتے گرتے بچی مگر خیر کسی طرح دوکان پر پہنچ گئی۔پہنچی اور قیامت کا سامنا ہو گیا۔وہ سامنے سے آ گئے۔

اپنے مالک کا شکر ادا کرتے کرتے وہ تھکی جا رہی تھیں۔بار بار دل کو بھی تسلی دیتی وہ مجھے پہچان نہیں پائے ہوں گے۔برسوں ہو گئے ایک دوسرے کو دیکھے بلگرام چھوڑے۔سولہ سال کا طویل عرصہ گزر گیا ان کی اولادوں کی اولادیں سمجھ دار ہو گئیں اور وہ خود کس قدر بدل گئی ہیں کچھ وقت کے ہاتھوں کچھ اپنے ہاتھوں۔

بہوؤں کی نظریں بچا کر وہ دالان کے کونے میں سنگار میز تک گئیں اور آئینے میں اپنے عکس کو گھورنے لگیں چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔

سفید کلف دار ساڑھی ہرے رنگ کا بلاؤز، ننھا منا سا خضاب سے سیاہ جوڑا، ہاتھوں میں سونے کے کڑے، کانوں میں فیروزے ٹاپس، زمین آسمان کا فرق تھا۔

کریمن بوا اور کفائت بیگم میں۔

ان کے کانوں میں بڑی سرکار کی آواز ایک نقارے کی طرح بج اٹھی ایسی کہ کان جھن جھنا گئے۔

''کریمن۔او کریمن ارے کہاں مر گئی کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ تیل ڈال لیا۔''

اف اچانک اتنے برسوں کے بور بڑی سرکار کا سراپا آئینہ میں آ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا انکا سراپا۔آئینہ میں آ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا انکا سراپا پیچھے چھپ گیا۔

ٹھاٹھ-دار-رعب دار-گوری چٹی بڑی سرکار آواز بھی کیا پاٹ دار اور گونج دار تھی۔ پکارتیں تو پوری حویلی گونج جاتی۔ اور وہ جو بھی کام کر رہی ہوتیں چھوڑ چھاڑ کر لپکتیں۔

''جی سرکار''

''کب سے پکار رہی ہوں۔ دیکھ باہر کچھ مہمان آ گئے ہیں ان کے کھانے کا خاص انتظام کرنا ہے۔''

پھر اچانک ان کو ہانپتے دیکھ کر بڑی سرکار کے ٹنانے دار لہجے میں نرمی آ جاتی۔

''ارے ذرا دم لے لے کولھو کا بیل بنی رہتی ہے نامراد۔ کچھ کام ان حرام خور لونڈیوں سے بھی لے لیا کر جو مفت کے نوالے اڑایا کرتی ہیں۔''

حویلی میں ان گنت لونڈیاں باندیاں تھیں مگر بڑی سرکار کی منھ لگی یہی کریمن تھیں۔ کریمن بوا۔ آج کی کفایت بیگم ایک جھرجھری سی لیکر انہوں نے ایک لمبی سانس بھری۔

بڑی سرکار کی مہربانی کی وجہ سے بڑے سرکار بھی انکا خاص خیال رکھتے تھے نرمی سے بات کرتے اور اپنے زیادہ تر کام انہیں سے لیا کرتے کیوں کہ جو تمیز تہذیب سلیقہ ان کے پاس تھا دوسری کوئی خادمہ ان کے پاسنگ برابر نہ تھی۔ ان کے ہاتھ سے پکے سالن-بریانی-بڑی بڑی جہازی -چپاتیاں- اچار- چٹنی- حلوے- ملیدے-لوگ چٹخارے لے کر کھاتے اور فرمائش کرتے۔

''ارے بھائی-کریمن بوا کے ہاتھ کی بات ہی کیا ہے۔''

بڑا فخر تھا ان کو اپنے اوپر۔ باورچی خانے کی مالک تھیں وہ۔ ان کے بغیر پتہ نہ ہلتا وہ اچانک چونکیں اور بڑی سرکار کے خوبصورت رعب دار عکس کو بڑی مشکل سے اپنے عکس کے پیچھے چھپایا۔ اب ۔ وہی کریمن بوا تھیں جو اپنے کریمن کے عکس کو کفایت بیگم کے سراپا میں دیکھ رہی تھیں پھر ایک کپکپاہٹ سی ان کے اندر آئی ایسی کہ رگ رگ ہل کر آ گئی۔ کتنا لمبا عرصہ لگا تھا ان کو کریمن سے کفایت بیگم بننے میں وہ اسی حویلی کو بھول چکی تھیں جو سنا ہے اب کھنڈر بن چکی تھی۔ لاکھ کا گھر زمانے کے ہاتھوں خاک ہو چکا تھا۔ بس ایک بار وہ بلگرام گئیں تھیں لکھنؤ آنے کے بعد۔ اب ان کے بچے بڑے ہو گئے تھے اور زمانے کی رفتار کو دیکھ رہے تھے سمجھ رہے تھے یہ سرکار اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ شان ختم ہو چکی ہے اب وہ دسترخوان سمٹ کر ایک بالشت کی پٹی میں آ چکا ہے جس پر کبھی ہزاروں کھاتے تھے اور کمی نہ ہوتی تھی۔ بہانے سے ماں کو ساتھ لیا اور پھر ایسا لائے کہ جانے نہ دیا۔ سچ پوچھو تو اب کریمن بوا بھی کچھ اور ہی خواب دیکھ رہی تھیں۔ دل میں بڑی سرکار بن کر رہنے کی تمنا نے اتنا زور پکڑا کہ وہ بالکل بڑی سرکار بن گئیں۔ اپنے لڑکوں کی نوکریوں کا بہانہ کر کے حویلی چھوڑ دی لیکن تصور میں اس کو ساتھ لے آئیں۔ چھوٹے سے گھر کو بڑا رنگ و روپ دیا۔ جو برتن بھانڈے کچھ اور سامان بڑی سرکار کی بہو نے بطور صدقہ خیرات دے دیا تھا اس کو انہوں نے بڑے سلیقہ سے جما لیا کوٹھری میں سارے صندوق سجا دیئے گئے بڑے سرکار کی نماز کی چوکی پر پرانہ قالین بچھا کر گویا بڑی سرکار کا چار تختوں کا چوکا بن گیا۔ گاؤ تکیوں میں روئی یا اسپنج کی جگہ پرانہ گودڑ بھر کر شوق پورا کر لیا گیا۔ بڑی سرکار کا پیتل کا بڑا اوگلدان وہ بڑی بہو سے بیگم کی نشانی کے طور پر لے آئیں تھیں۔ دھو مانجھ کے اسے چوکی کے برابر رکھ لیا گیا۔ ڈالڈہ کے پرانے ڈبوں میں نخاس سے پیڑ پودے خرید کر آنگن میں رکھ دیئے گئے۔ دالان کے دروں پر پرانی ساڑھیوں کے پردے پڑ گئے اور ایک اچھے دن تاریخ کو کریمن کا نام کوڑے کی ٹوکری میں ڈال کر وہ کفایت بیگم کے نام سے مشہور ہو گئیں۔

آہستہ آہستہ جگہ بنتی گئی نام کا اثر بڑھتا رہا۔ بڑی بہو کو کوٹھی کی جہاندار دلہن کا خطاب دیا گیا کیوں کہ وہ ذرا صورت کی بھی اچھی تھی اور پہن اوڑھ کر چال اور بولی بدل کر واقعی کسی اونچے گھرانے کی چیز لگتی تھی۔ محلے میں بڑا نام ہو گیا۔ شان ہو گئی۔ ہر نذر و نیاز خوشی غمی میں بلگرام کی بیگم- کہہ کر بلائی جانے لگیں۔ پوتے پوتی جب انہیں دادا یا دادی کے بجائے دادی بیگم پکارتے تو کلیجہ گز بھر کا ہو جاتا۔ میاں کو بھی انہوں نے کل کا گڈا بنا دیا تھا۔

''یوں اٹھو جیسے سرکار اٹھتے تھے۔ یوں بولو جیسے سرکار بولتے تھے یوں کھانسو جیسے سرکار کھانستے تھے''

16 سال میں کیا سے کیا ہو گئیں وہ کیسے مزے کے دن گزر رہے تھے ہر طرف کفایت بیگم کی پکار تھی بڑے سرکار کے خاندان کو وہ اپنے خاندان کے طور پر پیش کرتی تھیں لوگ کیسے عزت نہ کرتے بلکہ یہ بھی لوگ کہتے ہیں اس محلے کے بہت سے گھر زمینداروں اور جاگیرداروں کی تباہی کے ساتھ بڑے بن گئے تھے۔ اب یہ سب بڑے ایک تھے اور اپنا ماضی بھول چکے تھے-مگر آج:

وہ سہانا خواب ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا، حقیقت کے پتھر نے چکنا چور کر دیا تھا - اچانک وہ سامنے آ گئے تھے۔!!!

بڑے سرکار پہلے تو وہ پہچان نہ سکیں-ایک دبلا پتلا، ہانپتا کھانستا لرزتا بوڑھا نہ پہچان سکیں وہ پانی والے سے۔

''آئے بھیا-ایک ڈھولی پان کی تو دینا مگر اچھی ہو اچھے پانوں کے اندر سڑے گلے پان نہ بھرے ہوں نہیں تو قیامت مچاوں گی- یہ سمجھ لینا۔''

قیامت مچاووں گی - یہ جملہ بڑی سرکار کا تھا۔ وہ دن میں کم از کم پچاس بار اسے بولتی تھیں۔

''قیامت مچاووں گی کریمن- یاد رکھنا!''

کھٹ کی آواز ہوئی پکی سڑک پر- یہ آواز اس چھڑی کی تھی جو اس بوڑھے شخص کے ہاتھ میں تھی اور

جس کے سہارے وہ چل رہا تھا۔ چھڑی اس کھٹ کی آواز کے ساتھ سڑک پر ٹک گئی وہ اس کی موٹھ پر دونوں ہاتھ ٹیکے کریمن بوا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کریمن بوا کا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

اللہ، یہ آنکھیں - وہ نیلی پتلیوں والی سحر انگیز آنکھیں۔

یہ تو..... یہ تو..... بڑے سرکار کی آنکھیں تھیں۔ وہ چمک مدھم ہوچکی تھی دھندلا پن آ گیا تھا پھر بھی جادو ابھی باقی تھا۔

رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر
آنکھ جس جانب تمہاری اٹھ گئی

والی آنکھیں اور ان آنکھوں سے اتر کر کریمن بوا کی آنکھیں اس چھڑی پر آٹکیں جو ان کے ہاتھوں کو تھامے تھی۔

اس چھڑی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھیں، حواس باختہ سی ہوکر وہ پلٹیں اور جتنی تیزی سے ممکن تھا گھر کی طرف بھاگیں۔ سینڈل ان کو بار بار گرنے کی دھمکی دے رہی تھی مگر وہ رکیں نہیں۔ گھر میں گھس کر انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کیا کنڈی لگائی اور کیواڑوں سے ٹک کر کھڑی ہوگئیں۔ کانوں میں ایک مانوس گنگناہٹ برسوں کے بعد کسی طرف سے آئی اور گونجنے لگی۔ بڑے سرکار کا پسندیدہ شعر تھا جس کو وہ برابر گنگنایا کرتے تھے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

''چپ رہو- ہر وقت بس یہی نامراد شعر پڑھا کرتے ہو''

وہ بالکل بڑی سرکار کی طرح چلا کر بولیں اور پھر چونک کر چاروں طرف دیکھا- بڑی بہو دروازے میں جھانک رہی تھی۔

''کیا ہوا امی جان۔''

اب وہ امی جان کہی جانے لگی تھیں ورنہ پہلے اماں پکاری جاتی تھیں۔

''ایں؟ کچھ نہیں'' مرے مرے قدموں سے اندر آئیں - طائرانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف بڑے سرکار کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہر کونے سے بڑے سرکار کی آواز آرہی تھی۔

''چپ رہو ہر وقت وہی نامراد شعر.....''

کانوں میں بار بار وہی کھڑ کھڑ گونج رہی تھی۔

''اف انہوں نے اپنا سر تھام لیا''

''کیا ہوا می جان؟'' بہو نے پھر پوچھا۔

وہ ایک دم گلا پھاڑ کر چلائیں۔

امی جان نامراد گئی چولھے میں۔ اماں کہو۔ اماں۔

اس چھڑی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھیں، حواس باختہ سی ہوکر وہ پلٹیں اور جتنی تیزی سے ممکن تھا گھر کی طرف بھاگیں۔ سینڈل ان کو بار بار گرنے کی دھمکی دے رہی تھی مگر وہ رکیں نہیں۔ گھر میں گھس کر انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کیا کنڈی لگائی اور کیواڑوں سے ٹک کر کھڑی ہوگئیں۔ کانوں میں ایک مانوس گنگناہٹ برسوں کے بعد کسی طرف سے آئی اور گونجنے لگی۔

پھر گلا روندھنے لگا۔ مرگئی امی جان.....''

اتنے میں دروازہ بجا

''دادی جان۔ دادی جان..... دروازہ کیوں بند ہے''

بچے تھے اسکول سے آگئے تھے انہوں نے ڈر ڈر کر دروازہ کھولا۔ ہائے ..... کہیں وہ نہ پتہ لگاتے لگاتے آگئے ہوں۔ آنکھوں کے سامنے شہزادہ جیسے بڑے سرکار آگئے۔

صاف شفاف کرتا پاجامہ۔ عطر کی خوشبو اڑتی ہوئی گورے مضبوط پیروں میں نرم جوتی..... وہ بڑے میاں ملگجے کرتے پاجامہ میں پھٹی چپلوں میں منتشر کھچڑی بالوں کے ساتھ دل میں ایک درد اٹھا آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

''کیا ہوا دادی جان؟''

بڑے پوتے نے حیرت سے پوچھا

''دادی گئی چولھے میں اب جو دادی جان کہا قیامت مچادوں گی۔ دادا کہو دادا.....''

دوسرے پوتے نے آگئے بڑھ کر کہا۔

''دادا ابھی جب اہم لوگ رکشے سے اتر رہے تھے تو ایک بوڑھے آدمی نے پوچھا کیا اس محلے میں کوئی کریمن رہتی ہیں۔''

''تو پھر.....انہوں نے چیخ کر پوچھا کیا تم نے بتادیا ہاں نامراد کریمن یہیں رہتی ہے۔''

پوتا ان کے اس روپ سے سہم گیا ڈری ڈری آواز میں بولا۔

''نہیں -نہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کیا معلوم کریمن کون ہے۔''

''دادی - دادا - پوتی بولی کیا وہ فقیر آپ کو جانتا ہے۔''

''فقیر.....ان کے دل میں جیسے کسی نے چھورا گھونپ دیا۔ سارے احساسات زندہ ہوگئے۔ وہ سارا زمانہ پھرکی کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ گیا۔''

وہ فقیر نہیں ہیں۔ حلق پھاڑ کر وہ چلائیں، وہ میرے بڑے سرکار ہیں۔ میرے کھوئے ہوئے بڑے سرکار- میرا گزرا ہوا زمانہ- میرا بیتا ہوا کل- ہائے میں صدقے میں قربان- وہ سارے بچوں کو ڈھکیلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر لپکیں اس بار انہوں نے سینڈلیں اتار کر پھینک دی تھی اور ننگے پیر تھیں۔ بھاگتی ہوئی دوڑتی ہوئی وہی پہلے جیسی تیزی پھرتی جب بڑے سرکار کی ایک آواز پر دوڑتی تھیں۔ ان کی آواز پوری گلی میں گونج رہی تھی۔

''میں کریمن ہوں - کفایت نہیں - کریمن ہوں- میں وہیں ہوں بڑے سرکار وہیں آپ کی نامراد کریمن.....''

❑❑❑

مُن مُن

مصطفیٰ علی

ریسرچ اسکالر

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی

رابطہ: 8299535728

منت میری جان، ارمان، جنون، سکون، امنگ، آرزو، حیات، کائنات سب کچھ تھی۔ میں اس سے ازحد محبت کرتا تھا۔ وہ میری روح کا درماں اور میری ذات کی تکمیل تھی۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ کام سے واپسی کے بعد اکثر اوقات ہم دونوں ساتھ ہوتے۔ ایک دوسرے سے باتیں کرتے مگر کچھ دنوں سے ہمارے بیچ ایک اور ذات کا اضافہ ہو گیا تھا، جو رفتہ رفتہ ہماری محبت کے درمیان بھی حائل ہونے لگا تھا۔ ایک دن جب میں گھر واپس آیا تو وہ اس تیسری ذات میں کچھ ایسی مستغرق تھی کہ مجھے میرے سلام کا جواب تک نہ ملا۔ اس دن پہلی بار میں نے چڑھ کر منت سے کہا:

''منت! تم مجھ سے بے پرواہ ہوتی جا رہی ہو۔ نہ جانے کس جنگل سے اسے پکڑ لائی ہو کہ جب دیکھو اسے گلے لگائے بیٹھی رہتی ہو، آخر تمہیں اس سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟''

''اوہ! سوری، کب آئے تم؟ میں نے دیکھا نہیں۔''

''کیسے دیکھو گی جب اس چڑیا کو لے کر بیٹھی ہو تو تمہیں کوئی اور چیز بھلا سجھائی دے سکتی ہے؟''

''اس ننھی سی جان سے تمہیں جلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری محبت سلامت ہے اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ دراصل ایسی حالت میں میری اس سے ملاقات ہوئی کہ میرا اس سے شدید لگاؤ ہو گیا۔''

وہ شاید ٹھیک کہہ رہی تھی کیوں کہ پہلے کبھی میں نے اسے کسی پرندے میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی پرندوں کی باتیں کرتے ہوئے سنا تھا اس لیے میں نے اس سے تفصیل سے بتانے کے لیے کہا تو اس نے اس طائر خوش نوا سے اپنی ملاقات کی روداد سنانی شروع کی:

''دن کے تین بج رہے تھے۔ موسم نہایت خشک تھا۔ مشرق سے چلنے والی گرم اور روکھی ہوائیں جسم میں سستی پیدا کر رہی تھیں۔ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا چل کر کچھ دیر اپنے باڑے ہی میں بیٹھ جاؤں۔ موسم خزاں بھی کوئی موسم ہے! چہار جانب بے برگ و بار درخت نظر آ رہے تھے۔ ندی نالوں کی کوکھ بھی سونی پڑی تھی۔ ہر طرف پتیوں کی سیج سی بچھی ہوئی تھی۔ اسی سیج پر ایک طرف ایک سرخ کتا پاؤں پسارے اطمینان سے لیٹا ہوا تھا۔ آس پاس گلہریاں اپنی خوراک تلاشتی پھر رہی تھیں۔ شاخوں پر بیٹھے پرندے الگ ہی اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ باڑے کے قریب ہی ایک چھاونی تھی۔ اس چھاونی میں دو

ستونوں کے درمیان ایک طویل طاق تھا۔اس پرایک گوریا اپنا بسیرا ڈالے ہوئے تھی۔طاق کے نیچے زمین پراس کا بچہ پڑا ہوا تھا۔وہ طاق سے نیچے کس طرح آیا۔خودگر گیا تھا یا گوریا نے دانستہ اسے زمین پرلا چھوڑا تھا، یہ مجھے نہیں معلوم مگر اس وقت ہر طرف سے میری توجہ ہٹ کر ان ماں بیٹے پر مرکوز ہوگئی تھی۔بچہ اوپر منہ اٹھا کر کچھ کہتا۔ماں اس کا جواب دیتی پھر نیچے اتر کر اس کے پاس آتی، اس کا بوسہ لیتی، اس کی پیٹھ تھپتھپاتی، ذرا آگے بڑھ کر گردن اٹھاتی، اپنے جسم کو نیچے کی طرف دباتی ، پھر پر پھیلاتی اور پرواز کر طاق پر بیٹھ جاتی۔وہاں سے اپنے بچے کو چیں چیں کر چہکارتی۔جب بھی اس کا بچہ اوپر دیکھ کر چیں چیں کرتا تو وہ وہی عمل پھر دہراتی۔گویا وہ اسے درسِ پرواز دے رہی تھی مگر اس کودکِ ناتواں کے پروں میں قوت پرواز ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔خوب کیڑے مکوڑے کھلائی ہوتی تو اس کے پروں میں توانائی آئی ہوتی یا پھر ہوسکتا ہے کہ ابھی وہ بچہ پندرہ دنوں کا نہ ہوا ہو۔گوریا کی اس انتھک کارروائی کو میں بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ اللہ جانے کب مواکلب سرخ اس چڑیا کے بچے کے سر پر پہنچ گیا۔میں دُر دُر اور گوریا چیں چیں کرتی ہوئی اسے بچانے کے لیے دوڑی لیکن وہ خبیث اسے جھپٹ کر برق رفتاری سے فرار ہوگیا۔میں اور گوریا مایوسی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔یہ پہلا اتفاق تھا جب میں اس سے ملی۔پھر جب بھی میں باڑے کی جانب نکلتی میری اس سے ملاقات ہو جاتی۔ اس سانحے نے میرے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ یہ لطافت، انسیت ولگاوٹ میں بدل گئی۔اب تو میں نے اسے ایک نام بھی دے دیا ہے"مُن مُن"۔

"مُن مُن، بہت ہی پیارا نام ہے۔"میں نے منت سے کہا اور اس پرندے کو بغور دیکھنے لگا۔وہ ایک خاکی مائل بھورے رنگ کی چھوٹی موٹی، گول مٹول چڑیا تھی۔بمشکل ۱۵ گرام اس کا وزن ہوگا۔لمبائی بھی یہی کوئی ۳۰ سینٹی میٹر رہی ہوگی۔زمین پر پھدک پھدک کر چلا کرتی تھی۔اس کی چھوٹی سی آنکھوں میں ۴ر لاکھ فی ملی میٹر فوٹو ریسیپٹرز کی توانائی والی ریٹینا قدرت نے عطا کی تھی۔ اپنی چھوٹی سیاہ چونچ سے وہ انواع واقسام کی اشیاء کھاتی، زیادہ تر گھاس پھوس کے بیج، جامن اور حشرات الارض کو اپنا نوالہ بناتی تھی۔بالکلیہ وہ بہت خوبصورت اور سودمند چڑیا تھی مگر مجھے جس چیز سے دقت تھی وہ منت کا اس کی طرف اس قدر متوجہ رہنا اور میری جانب سے تغافل برتنا۔ابھی اس سے ملے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہوں گے اور اتنے کم دنوں میں ہی دونوں کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔میں نے منت کو زچ کرنے کے لیے اس سے الٹے سیدھے سوالات کرنے شروع کر دیے:

"کیا تم اس کی باتیں سمجھ لیتی ہو؟"

"ہاں! بالکل۔"

"مکمل؟"

"نہیں، اکثر۔"

"کمال ہے! بھلا وہ کیسے؟ میرا مطلب یہ تو ایک بےنطق پرندہ ہے۔"

"بےنطق کیوں ۔۔۔اچھا خاصا بولتا تو ہے اور جب گونگوں اور خبط الحواسوں کی باتیں سمجھی جا سکتی ہیں تو اس کی کیوں نہیں؟"اس جواب سے کچھ دیر کے لیے میں لاجواب ہوگیا۔چند لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا:

"ہاں درست ہے مگر اسے باڑے ہی تک محدود رکھنا، یہ کم ذات گھر میں آتی ہے تو گندگی پھیلاتی ہے۔"

"تمہیں یاد ہے ایک بار تمہارے جسم پر دور تک بڑے بڑے چھالے پڑ گئے تھے۔تم اس سے کتنی کراہیت اور درد محسوس کر رہے تھے۔ہے کہ نہیں؟ مُن مُن گھر میں آیا کرے گی تو ہمیں ایسے کیڑے نقصان نہیں پہنچا پائیں گے کیوں کہ وہ ایسے موذی کیڑوں کو اپنی خوراک بنا لیتی ہے۔"

"اور کھیتوں میں بوئے ہوئے دانوں کو بھی اپنی خوراک بنا لیتی ہے جس سے کاشت کاروں کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے، وہ تو نہیں بتاؤ گی۔"میں نے بازی جیت لینے والے انداز میں منت کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔اس پر وہ مسکراتے ہوئے بولی:

"تمہیں اس کی صرف برائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ارے اس ننھی سی جان کی خوراک ہی کیا ہے۔یہ تو معمولی کیڑے مکوڑے پر بھی اپنا گذر بسر کر لیتی ہے۔اس سے ہمیں نقصان کم، نفع زیادہ ہے۔یہ سوال جو آج تمہارے ذہن میں آیا ہے ۱۹۵۰ء کے دہے میں چینی سرکار کے ذہن میں بھی آیا تھا۔لہذا، اس نے ان معصوموں کے قتلِ عام کا فرمان جاری کر دیا۔لاکھوں بے گناہ گوریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔باقی ماندہ گوریوں نے دہشت زدہ ہو کر وہاں سے ہجرت کا راستہ اختیار کر لیا۔یہ کارروائی فصل بچانے کے لیے کی گئی تھی مگر ہوا اس کے برعکس۔چند ہی برسوں میں وہاں فصلوں پر تباہی آ گئی۔کئی فصلیں برباد ہونے پر جب قحط جیسی حالت پیدا ہوگئی تو حکومت چین نے اس کی وجہ دریافت کی۔معلوم ہوا اب فصلوں میں کیڑے لگ جا رہے ہیں، پہلے گوریا انہیں کھا جایا کرتی تھی۔۔۔سمجھے کچھ؟ اب اگر بیچاری بطور معاوضہ کچھ دانے چگ ہی لیتی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟"منت نے تیوری پر بل دیتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"چینیوں کو عقل نہیں تھی، انہیں کیمیائی مادیات کا استعمال کرنا چاہیے تھا۔گوریا کھاتی نہ کیڑے لگتے اور نہ ہی ان کے سر قتل کا الزام آتا۔کام ایسا کرنا چاہیے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"میں نے منت کو چھیڑنے کے لیے کہا۔

"کیمیائی مادیات کا استعمال محض ان کے لیے خطرے کی گھنٹی نہیں ہے جناب بلکہ ہماری صحت کے لیے بھی مضر ہے۔کبھی ماہر اطباء سے مشورہ لو تو پتہ لگے۔یہ کسی زر خرید زہر سے کم نہیں، اور اس وقت ایسی واہیات اشیاء کا چلن بھی نہیں تھا ورنہ تمہاری سوچ پر چینی ضرور کھرے اترتے۔"منت نے یہ کہتے ہوئے مُن مُن کی طرف دیکھا

اور دردبھرے لہجے میں بولی: ''یہ درختوں کا صفایا، باغ بغیچوں کا خاتمہ، بلنداور پکی عمارتوں کی تعمیر، یہ صنعتی ترقی اور ابلاغیاتی انقلاب، یہ موبائل ٹاور کے ریڈیشن، کارخانوں فیکٹریوں سے خارج ہوتے دھوئیں، یہ کاربن اگلتی گاڑیاں یہ سب ہماری عمریں گھٹا رہی ہیں اور مُن مُن جیسوں کی زندگی بھی خاک میں ملا رہی ہیں۔''

منت کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ ایسا بکوں جس سے اس کا ذہنی تناؤ کم ہوجائے، میں نے ہنستے ہوئے کہا:

''عمر سے یاد آیا تمہاری مُن مُن کتنے سال کی ہے؟''

''کیوں، تمہیں اس سے شادی کرنی ہے؟''

''نہیں، بس یوں ہی پوچھ لیا، نہیں بتانے کا من ہے تو مت بتاؤ۔''

''ارے یار یہ پرندے دو چار سال سے زیادہ نہیں جیتے۔ ہاں ڈنمارک میں ایک گوریا انیس سال تک زندہ رہی تھی، جسے ایک ریکارڈ مانا جاتا ہے۔''

''اچھا!۔۔۔ اچھا پہلے تو گوریا جھنڈ کے جھنڈ چلا کرتی تھیں مگر اب بہت کم نظر آتی ہیں۔''

''کم! ارے اب تو انہیں سرخ بہی (ریڈ لیسٹ) میں ڈال دیا گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب یہ بھی گدھ اور ماریشس کے ڈوڈو کی طرح تاریخ بن کر رہ جائیں گی، تمہیں تو پھر بھی اس کے کم ہونے کا احساس...''

ابھی منت بول ہی رہی تھی کہ میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ اس دن پہلی بار میں نے منت سے اس کی مُن مُن کے سلسلے میں اتنی باتیں کی تھیں۔ اس کے بعد روز ہی مُن مُن کچھ نہ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں کے لیے بحث کا موضوع بنتی۔ ایک دن جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو میں نے مُن مُن کے پاس ایک چڑے کو دیکھا، جو اسی کے مشابہ تھا بس اس کی گردن پر بنی پٹی کالی تھی۔ میں نے منت سے اس سے متعلق دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ مُن مُن پر فدا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ جب اس کے ذریعے بنایا ہوا مصنوعی آشیانہ خراب ہو گیا تھا تو اسی نے مُن مُن کے لیے نیا گھونسلا تعمیر کیا تھا اور اب مُن مُن زیادہ تر اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ منت نے اس فدائی کا نام ''چُن مُن'' رکھ دیا تھا۔ ایک دن میں نے منت کو قطب مینار کی سیر کے لیے راضی کیا تو اس نے مُن مُن کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور مُن مُن نے چُن مُن کو۔ وہاں خوب تفریح ہوئی۔ شام پانچ بجتے ہی قطب مینار کا پھاٹک بند کرنے کے واسطے اس کا پہرے دار آواز لگانے لگا۔ سب کے ساتھ ہم بھی نکل ہی رہے تھے کہ ہم نے دیکھا مُن مُن دو بلیوں کے نرغے میں پھنس گئی ہے، ہم اس سے بہت دور تھے اس لیے محض ترستی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور تھے، تبھی ہم نے دیکھا کہ تہتر میٹر بلند قطب مینار کی چوٹی سے مُن مُن کا یار برق رفتاری سے اس کے پاس پہنچا۔ بلیوں نے اس کی اور جھپٹا مارا، وہ جس رفتار سے آیا تھا اسی رفتار سے بھاگا۔ ادھر بلیوں کا دھیان اپنی طرف سے ہٹتے دیکھ مُن مُن نے بھی پر پھیلا کر اڑان بھری۔ اس کو ہلکی سی چوٹ آ گئی تھی۔ گھر پہنچ کر منت نے اس کی مرہم پٹی کی۔ کچھ دنوں بعد وہ بالکل چنگی ہو گئی۔

ایک دن صبح میری آنکھ تاخیر سے کھلی۔ میں نے دیکھا منت بھی ابھی تک سو رہی ہے۔ میں نے اس کو جگا کر پوچھا کہ کیا بات ہے آج تمہاری مُن مُن ہمیں جگانے نہیں آئی، دیکھو کتنی دیر ہو گئی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم اتنی گھبرا کیوں گئی۔ تو اس نے بتایا کہ:

''کل ہولی کے دن کسی احمق نے مُن مُن پر رنگ پھینک دیا تھا۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس کی حالت انتہائی نازک تھی۔ میں نے اس کا علاج کرنا چاہا مگر وہ مجھے کہیں لے جانا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ گئی بھی مگر اندھیرا پھیلنے لگا تو میں واپس چلی آئی۔ میں اس کو بھی ساتھ لانا چاہتی تھی پر وہ تو اپنی ہی ضد پر اڑی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ مجھے لگتا ہے جس نے اس کے اوپر رنگ پھینکا تھا وہ اسی کو دکھانے لے جانا چاہتی تھی، پر ابھی تک وہ آئی کیوں نہیں؟ اس کی طبیعت بھی ناساز ہے۔ چلو ناچل کر اس کو ڈھونڈتے ہیں۔''

ہم دونوں اسے تلاشتے ہوئے ایک باغیچے میں پہنچے۔ وہاں کا ماحول ناخوش گوار لگ رہا تھا۔ پھولوں کا رنگ جیسے اڑا اڑا ہو، پتیاں مرجھائی ہوئی اور شاخیں بے جان ہو، ہواؤں میں سوز کی بو لپٹی ہوئی اور پرندوں کی چہچہاہٹ میں ماتم زدگی کی دُھن ملی ہوئی ہو، جیسے وے کچھ گا نہ رہے ہوں بلکہ چمن کی بے وفائی کا ہمیں نغمہ سنا رہے ہوں۔ وہیں ببول کے درخت کی ایک شاخ پر مُن مُن مغموم بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے اس کو آواز دی پر وہ دوسری جانب مڑ کر بیٹھ گئی اور اپنی دم جھٹکنے لگی۔ مسلسل دیر تک آواز لگانے کے بعد وہ ہماری طرف آئی۔ منت کے شانے پر بیٹھ کر آنسو کے چند قطرے ٹپکائی پھر چیں چیں کرتی اڑ کر ایک درخت کی طرف چلی گئی جہاں ایک دھاگا درخت کی ٹہنیوں میں الجھا ہوا تھا اور اس دھاگے سے چُن مُن کا پنجہ بندھا ہوا تھا اور وہ اس میں پھنسا بے حس و حرکت الٹا لٹک رہا تھا۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر ہماری چیخیں نکل گئیں۔ بیک وقت منت نے مجھے اور میں نے اسے دیکھا۔ منت کے چہرے پر اس وقت جو کچھ لکھا تھا اسے میں صاف طور پر پڑھ سکتا تھا۔ مُن مُن کل اتنی پریشان کیوں تھی اور وہ منت کو کس لیے اور کہاں لے جانا چاہتی تھی، یہ اب ہم دونوں بہت اچھی طرح سمجھ رہے تھے مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا؟ کچھ ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ مُن مُن چُن مُن کے قریب جا کر پاگلوں کی طرح اپنی منقار سے اپنے پنکھ نوچ رہی ہے۔ ہم نے اسے بارہا آواز دی، ایسا کرنے سے منع کیا لیکن اس پر اس وقت جیسے جنون سوار تھا۔ اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رکی اور اس نے چن من کی طرف دیکھا پھر وہ چُن مُن کی چونچ میں چونچ ڈال کر اس کے بے روح جسم سے لپٹ گئی اور خود بھی بے روح ہو گئی۔

❑❑❑

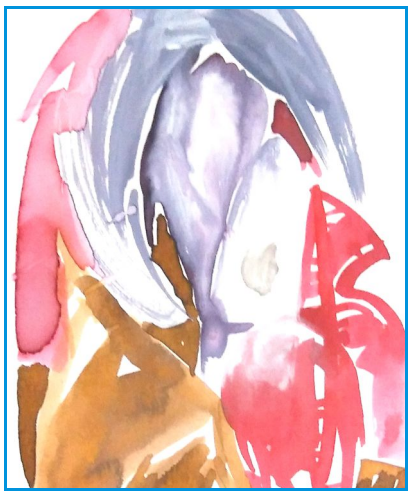

احساس

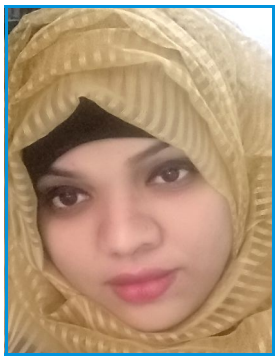

صالحہ صدیقی
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی
رابطہ: 9899972265

آواز نے ایک دن آواز دے کر اداسی سے پوچھا تم کیوں پریشان رہتی ہو؟ تم کیوں بیزار رہتی ہوں؟ تمہارے چہرے کے رنگ ہمیشہ بے رنگ کیوں رہتے ہے؟ تم نے کیوں تنہائی کو اپنا مقدر بنا لیا ہے؟ تم کیوں خود کو سمیٹ کر ساری دنیا سے الگ اپنی ہی دنیا میں سمٹی رہتی ہو؟ آواز خاموش قدموں سے اداسی کی جانب بڑھتی گئی.....اداسی سوچ میں پڑ گئی کہ یہ آواز کون ہے؟ جس نے مجھے آواز دی۔

اس کے ذہن میں خوف کے ہزاروں سوال گردش کرنے لگے، وہ خود میں سمٹتی جا رہی تھی کہ آواز آئی، ارے.....ارے ڈرو نہیں مجھے تم اپنا دوست ہی سمجھو، میں بھی تو تمہاری طرح اس خوبصورت کائنات کا ایک حصہ ہوں.....یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر اپنی انگلی کو اداسی کی انگلی کی طرف بڑھا دیا اور کہا چھو کر دیکھو..... اداسی نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بنا سوچے اپنی انگلی سے اس انگلی کو چھونے لگی، اس کا خوف کم ہوا لیکن لب اب بھی خاموش..... آواز نے مسکراتے ہوئے کہا.....دیکھا! تم خواہ مخواہ ڈر رہی تھی کہہ کر اداسی کے بازو میں بیٹھ گیا اور بغور اداسی کو دیکھتے ہوئے بولا.....تم کتنی خوبصورت ہو کیا تمہیں معلوم نہیں؟ ہاں بس لوگ تم کو ذرا الگ نگاہ سے دیکھتے ہیں.....یہ سن کر اداسی زمین کی طرف نگاہیں گڑائے دیکھنے لگیں.....لیکن یہی تمہاری شناخت ہے۔ تم انسانی زندگی کے اندر دھنش کے سات رنگوں میں ایک اہم رنگ ہو، تمہارے بنا وہ اندر دھنش نامکمل ہیں۔ یہ سن کر اداسی حیرت سے آواز کو تکنے لگی، آواز نے اداسی کا ہاتھ تھام لیا اور اداسی مسکرا اٹھی۔

آواز اداسی کی جانب گہری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی.....تم کو علم نہیں اداسی کہ تم کتنی طاقتور ہو، تم جب بھی کسی انسانی ذہن و دل میں سرایت کرتی ہو اس کے خون میں بہتی ہو تو انسان کو اس دنیا کی سیر کراتی ہو جو وہ خوشی میں کبھی دیکھ سن نہیں پاتا، نہ محسوس کر سکتا ہے، تم ہی تو ہو جو ہزار زاویے سے انسان کو سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہو، کائنات کے بھید کو، اپنے پرایوں کے راز کو عیاں کرتی ہو.....اداسی ٹکٹکی باندھے آواز کی باتیں غور سے سن رہی تھی آواز اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے.....میں بھی تمہارا حصہ ہوں جب تم کسی کی زندگی میں داخل ہوتی ہو تو میں تمہارے ساتھ ساتھ اس انسان کے جذبات کو بیان کرنے میں مدد کرتا ہوں، اس انسان کی دلی و ذہنی کیفیات کو تمہارا رنگ دے کر بہتا ہوں۔

یہ سن کر اداسی ہولے سے مسکرائی اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ آواز بھی مسکرا اٹھا.....

وقت گزرتا رہا آواز کی باتیں اداسی اب دلچسپی سے سننے لگی تھی اسے آواز کی اب عادت سی ہونے لگی تھی اسے ہر وقت آواز کو سننے اسے اپنے پاس ہونے کا ارمان ہوتا، آواز بھی اداسی سے باتیں کرتا رہا کبھی کائنات کی، تو کبھی زندگی کی، اداسی آواز سے جڑتی چلی گئی اور اس کی ہمت اور حوصلہ افزا باتوں میں خود کو منسلک کرتی گئی۔

اداسی آواز سے کب ایک انجانے رشتے میں بندھ گئی اسے خود بھی احساس نہیں ہوا۔آواز کی باتیں اس کے اندر نئے احساس پیدا کرنے لگیں، اب یہ کیفیت تھی کہ اداسی ہر وقت آواز کی باتیں سننے کے لیے بے چین رہتی، وقت گزرتا گیا اور دونوں باتیں کرتے گئے۔

ایک دن طوفان آیا، زوردار بجلی کڑکی، آواز کو بجلی سے بہت ڈر لگتا تھا، اس نے اداسی سے کہا تم اس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاؤ۔

اداسی نے آواز کا ہاتھ خوف سے جکڑ لیا اور نم آنکھوں سے التجا کرنے لگی کہ مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔

آواز نے تسلی دی کہ طوفان تھمتے ہی وہ پھر لوٹ آئے گا۔

اداسی نے بھروسے بھرے اس لہجے اور امید پر آواز کو اجازت دے دی.....طوفان تھما بجلی کی گڑ گڑاہٹ بھی بند ہوگئی.....

مگر آواز.....آواز کہاں گیا.....؟

اداسی در بدر بھٹکتی رہی، لیکن آواز کی کچھ خبر نہیں ملی، اداسی کے ذہن و دل میں سوالوں کا طوفان سر اٹھانے لگا.....

بے چینی سے ادھر ادھر بھاگتی رہی لیکن آواز کا کچھ پتہ نہ چلا.....تھک ہار کر اداسی پیڑ کے سائے میں

آواز نے ایک دن آواز دے کر اداسی سے پوچھا تم کیوں پریشان رہتی ہو؟ تم کیوں بیزار رہتی ہوں؟ تمہارے چہرے کے رنگ ہمیشہ بے رنگ کیوں رہتے ہے؟ تم نے کیوں تنہائی کو اپنا مقدر بنا لیا ہے؟ تم کیوں خود کو سمیٹ کر ساری دنیا سے الگ اپنی ہی دنیا میں سمٹی رہتی ہو؟ آواز خاموش قدموں سے اداسی کی جانب بڑھتا گئی..... اداسی سوچ میں پڑ گئی کہ یہ آواز کون ہے؟ جس نے مجھے آواز دی۔

اس کے ذہن میں خوف کے ہزاروں سوال گردش کرنے لگے، وہ خود میں سمٹتی جا رہی تھی کہ آواز آئی، ارے.....ارے ڈرو نہیں مجھے تم اپنا دوست ہی سمجھو، میں بھی تو تمہاری طرح اس خوبصورت کائنات کا ایک حصہ ہوں..... یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر اپنی انگلی کو اداسی کی انگلی کی طرف بڑھا دیا اور کہا چھو کر دیکھو..... اداسی نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بنا سوچے اپنی انگلی سے اس انگلی کو چھونے لگی، اس کا خوف کم ہوا لیکن لب اب بھی خاموش..... آواز نے مسکراتے ہوئے کہا ..... دیکھا! تم خواہ مخواہ ڈر رہی تھی کہہ کر اداسی کے بازو میں بیٹھ گیا اور بغور اداسی کو دیکھتے ہوئے بولا.....تم کتنی خوبصورت ہو کیا تمہیں معلوم نہیں؟ ہاں بس لوگ تم کو ذرا الگ نگاہ سے دیکھتے ہیں..... یہ سن کر اداسی زمین کی طرف نگاہیں گڑائے دیکھنے لگیں.....آواز آگے بولتے ہوئے لیکن یہی تمہاری شناخت ہے۔تم انسانی زندگی کے اندر دھنس کے سات رنگوں میں ایک اہم رنگ ہو، تمہارے بنا وہ اندر دھنس نامکمل ہیں۔ یہ سن کر اداسی حیرت سے آواز کو تکنے لگی، آواز نے اداسی کا ہاتھ تھام لیا اور اداسی مسکرا اٹھی۔

بیٹھ گئی اچانک اسے آواز آئی.....

اداسی !، اداسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آواز مسکراتے ہوئے اسی طرح کھڑا تھا۔ اداسی دوڑتے ہوئے اس کے پاس گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں..... کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر.....میں نے تمہیں کہاں نہیں ڈھونڈھا.....تم نے تو کہا تھا طوفان تھمتے ہی میں آجاؤنگا، پھر کیوں نہیں آئے، کہا کھو گئے تھے۔

اداسی یہ کہہ کر بے تحاشا رونے لگی، اس کے سوالوں، اس کی گھبراہٹ، بے چینی اور زار و قطار روتے دیکھ آواز نے کہا.....

اداسی! میں تو آواز ہوں کبھی خوشی کی، تو کبھی غم کی، کبھی حوصلے کی تو کبھی امید کی.....جس طرح میرے ہزاروں روپ ہیں اسی طرح تمہارا بھی ایک روپ ہیں اداس رہنا.....

یہ سن کر اداسی کو گہرا جھٹکا لگا، وہ کچھ دیر پھٹی آنکھوں سے آواز کو دیکھتی رہی.....

پھر بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے لرزتی آواز میں اداسی نے آواز کے دونوں کاندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

جب تمہیں پتہ تھا اداس رہنا میری قسمت ہے تو مجھے جینے کا حوصلہ کیوں دیا؟

مجھے خوشیوں سے واقف کیوں کرایا؟

میری اداسی کو احساس کے آئینے کیوں دکھائے؟

کیوں مجھے دنیا کی سیر کرائی؟

کیوں؟ کیوں؟ کیوں.....؟

آواز اداسی کی باتیں سن کر بے رخی سے اپنے کاندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا ''مان بھی جاؤ اداسی.....اداس رہنا ہی تمہاری قسمت ہیں''

یہ کہہ کر آواز چلی گئی، اداسی ایک بار پھر اپنا وجود سمیٹتی نئی اداسیوں کی دنیا لیے اداس بیٹھ گئی۔

❑❑❑

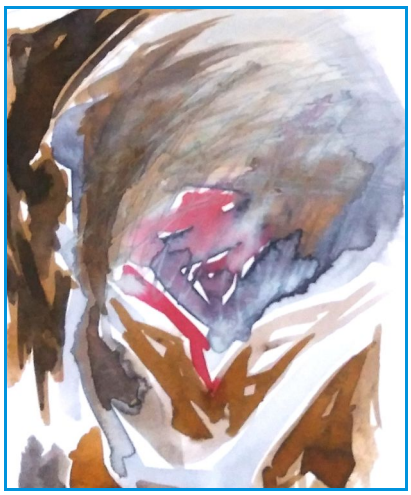

بچپن کی دوستی

سکندر علی شمکن

بیر پور

پوسٹ شیودہا، بہرائچ

رابطہ: 9519902612

وقت اپنے رفتار میں چل رہا تھا سلیم اور انس آٹھویں جماعت میں زیر تعلیم تھے دونوں میں اچھی خاصی دوستی تھی دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے کھیلتے اور گھر جاتے سلیم تو خوب جی لگا کر پڑھائی کرتا مگر اس کا دوست انس آوارہ گردی۔

دونوں کلاس میں پاس پاس بیٹھتے استاد جب پڑھاتے تو سلیم کتابوں پر خاص توجہ مرکوز کر کے پڑھائی کرتا مگر انس کا وقت ہمیشہ ہی برباد رہتا وہ چاہے کلاس ہو یا گھر۔

کبھی کبھی جب ان ٹریول میں سلیم کتابوں کا مطالعہ کرنے بیٹھتا تو انس ٹڈی دل بن کر اس پر ٹوٹ پڑتا۔

ایک دن سلیم کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا انس آیا اور بولا یار! تو، تو سارا دن پڑھائی کرتا رہتا ہے چل کھیلتے ہیں انس نے سلیم کی کتابوں کو بند کر دیا۔

سلیم نے فہیمانہ انداز میں انس سے کہا دیکھ یار! ماں باپ ہمیں تمہیں اس لئے پڑھاتے ہیں کہ ہم تم پڑھ لکھ کر والدین اور ملک کا نام روشن کریں نہ کی آوارہ گردی۔

اس پر انس نے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا یار کھیل بھی تو ہمارے جسم کو توانائی فراہم کرتا ہے کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو؟

نہیں مگر پڑھائی کے وقت پڑھائی کرنی چاہیے اور کھیل کے وقت کھیل سلیم نے کہا۔

سلیم تو وقت کا پابند تھا مگر انس نہیں۔

صبح آٹھ بجے ماں کے بار بار آواز دینے پر انس جاگتا اسے روزانہ گھر پہ ڈانٹ کھانی پڑتی تھی اور کالج پہنچتا تو سبق کے لئے ڈانٹ کھانی پڑتی۔

وہ کبھی کبھی سلیم سے دریافت کرتا کہ یار تو تو کبھی نہیں ڈانٹا جاتا دریں اثنا میں گھر پر والدین کا ڈانٹ کھاتا ہوں اور یہاں اساتذہ کا اس پر سمجھاتے ہوئے سلیم کہتا:

انس! یہ تیرے غلطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے ایک تو تو وقت کا پابند نہیں ہے اور دوسرا تجھے کتابوں کے مطالعہ سے پرہیز ہے انس جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے وقت بھی ان کا قدر نہیں کرتا اردو زبان

میں ایک قول ہے کہ وقت تلوار کی دھار ہوتی ہے اس لئے اگر تم وقت کے تقاضوں پر عمل کرو تو یقیناً تمہیں ذلت اٹھانی نہیں پڑے گی، اس پر ہنستے ہوئے انس کہتا عمل تو عامل کرتے ہیں یار عمل کرنا انس کے بس کی بات نہیں۔

انس پہ سلیم اور اس کے والدین کی باتوں کا اثر تب تک رہتا جب تک اسے سمجھاتے اس کے بعد جیسے ٹائر کے پنچر ہونے پر اس کا ہوا پھر ہو جاتا ہے ٹھیک ویسے ہی انس کے ذہن سے اچھی باتیں بھی پھر ہوجاتی۔

خیر دونوں بی۔اے۔تک ساتھ ساتھ پڑھتے رہے۔

بی۔اے۔کے تیسرے سال سلیم اول نمبر سے پاس ہوا دریں اثنا انس فیل ہوگیا۔

اسی سال انس نے پڑھائی چھوڑ دی اسے سلائی کرنے کے لئے بھی بھیجا گیا مگر اسے وہ کام بھی راس نہ آیا۔

وقت چلتا رہا دونوں دوست ایک دوسرے سے بچھڑ چکے تھے انس کی شادی ہو چکی تھی اس کے تین بچے بھی ہو گئے تھے۔

ایک ایک کر کے اس کے سبھی ساتھی بچھڑ گئے اسے جب کالج کی یاد آتی تو وہ ہائے کر کے رہ جاتا اب اس کی غلط فہمیاں دور ہو چکی تھی اب اسے سلیم کی قدیمی باتوں میں دم لگنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ انس اور اس کے اہل خانہ کی زندگی دوبھر ہونے لگی اب اسے پانچ لوگوں کا پیٹ پالنا پڑتا تھا اب وہ پیسوں کا قدر کرنا بھی سیکھ گیا اب وہ اپنے اہل خانہ کی برائے پرورش رکشہ چلانے لگا تھا انس سارا دن رکشہ چلاتا تو شام کو اسے 200 روپے موصول ہوتے اسی لئے شاید اس کی عقل ٹھکانے لگ گئی تھی۔

ایک دن انس رکشہ چلا رہا تھا جب اس نے رکشہ منزل پر روکا تو دیکھا ایک صاحب کے پاس اخبار تھا اس نے اخبار اس آدمی سے مانگا وہ بولا شکل سے تو پڑھے لکھے لگتے نہیں اخبار کیا کرو گے؟

خیر اس نے اخبار انس کو دے دیا اتنا جملہ سنتے ہی انس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر جو ہی اس کی نظر اخبار پہ پڑی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس کے چہرے پر عجب کیفیت طاری ہوگئی دراصل اخبار میں چھپا تھا سلیم احمد آئی اے ایس افسر بنیں۔انس نے خبر کو تفصیل سے پڑھا تو اسے معلوم ہوا کہ آج ہمارا دوست سلیم کامیابی کی منزل پر پہنچ گیا۔

انس آج بہت خوش تھا۔

ایک دن چوراہے پر بھیڑ کے سبب انس کو رکشہ روکنا پڑا اسی اثنا میں ایک آدمی اپنے حفاظتی گارڈ کے ساتھ اپنی موٹر کار میں سوار بھیڑ کے سبب سے رکا تھا وہ آدمی اپنی کار سے نیچے اترا۔

اتفاق سے اس کی نظر انس پر پڑی جو اپنے رکشہ کا ہینڈل پکڑے بدحالی کی صورت میں کھڑا تھا انس کو دیکھتے ہی وہ آدمی بے تحاشہ دوڑ کر انس کے پاس جا پہنچا انس اس آدمی کو نہ پہچان پایا مگر اس آدمی نے انس کو اپنے گلے لگا کر اپنا تعارف کرایا کہ میں سلیم احمد تمہارا دوست ہوں۔

یہ سن کر انس کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہوگئے انس کی حالت دیکھ کر سلیم بھی بہت غمزدہ ہو گیا، دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔

اس کے بعد سلیم نے کہا چل یار مدت کے بعد ملے ہیں میری موٹر کار میں بیٹھ کر تفریح کرتے ہیں اس پر انس نے کہا سلیم! میرے پاس برائے تفریح وقت درکار نہیں کیونکہ اگر میں آج رکشہ نہیں چلاؤں گا تو شام کو میرے اہل خانہ بھوکے ہی رہ جائیں گے۔

❑❑❑

انس پہ سلیم اور اس کے والدین کی باتوں کا اثر تب تک رہتا جب تک اسے سمجھاتے اس کے بعد جیسے ٹائر کے پنچر ہونے پر اس کا ہوا پھر ہو جاتا ہے ٹھیک ویسے ہی انس کے ذہن سے اچھی باتیں بھی پھر ہوجاتی۔

خیر دونوں بی۔اے۔تک ساتھ ساتھ پڑھتے رہے، بی۔اے۔کے تیسرے سال سلیم اول نمبر سے پاس ہوا دریں اثنا انس فیل ہوگیا۔

اسی سال انس نے پڑھائی چھوڑ دی اسے سلائی کرنے کے لئے بھی بھیجا گیا مگر اسے وہ کام بھی راس نہ آیا۔

وقت چلتا رہا دونوں دوست ایک دوسرے سے بچھڑ چکے تھے انس کی شادی ہو چکی تھی اس کے تین بچے بھی ہو گئے تھے۔

ایک ایک کر کے اس کے سبھی ساتھی بچھڑ گئے اسے جب کالج کی یاد آتی تو وہ ہائے کر کے رہ جاتا تاب اس کی غلط فہمیاں دور ہو چکی تھی اب اسے سلیم کی قدیمی باتوں میں دم لگنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ انس اور اس کے اہل خانہ کی زندگی دوبھر ہونے لگی اب اسے پانچ لوگوں کا پیٹ پالنا پڑتا تھا اب وہ پیسوں کا قدر کرنا بھی سیکھ گیا اب وہ اپنے اہل خانہ کی برائے پرورش رکشہ چلانے لگا تھا انس سارا دن رکشہ چلاتا تو شام کو اسے 200 روپے موصول ہوتے اسی لئے شاید اس کی عقل ٹھکانے لگ گئی تھی۔

ایک دن انس رکشہ چلا رہا تھا جب اس نے رکشہ منزل پر روکا تو دیکھا ایک صاحب کے پاس اخبار تھا اس نے اخبار اس آدمی سے مانگا وہ بولا شکل سے تو پڑھے لکھے لگتے نہیں اخبار کیا کرو گے؟

خیر اس نے اخبار انس کو دے دیا اتنا جملہ سنتے ہی انس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر جو ہی اس کی نظر اخبار پہ پڑی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

غزلیں

بدر واسطی
مکان نمبر ۹، چوکی امامباڑہ، امامباڑہ روڈ، بھوپال
موبائل: 9977311008

شجر ننگا ہے پر سوکھا نہیں ہے
کہیں کچھ بھی نہ ہو، ایسا نہیں ہے

جلانا ہی تو مشکل ہے عزیزوں
دیا جل جائے تو بجھتا نہیں ہے

تمہارے ساتھ جو تھے وہ کہاں ہیں
ترقی کا یہ ڈھنگ اچھا نہیں ہے

کسی کے پاس کچھ ہے تو کسی کے پاس ہے کچھ
یہاں کوئی گیا گزرا نہیں ہے

بتاشوں سیپیوں کا کیا کریں ہم
یہاں بچہ بھی اب بچہ نہیں ہے

غزل میں شعر کیسے ہوں غزل کے
تمہیں اک بار بھی برتا نہیں ہے

کبھی تو بدرؔ جی گھر جلدی لوٹو
بھٹکنا دیر تک اچھا نہیں ہے

دفتر کی دھول جھاڑ چلو پانچ بج گئے
سلجھائیں گے نواڑ چلو پانچ بج گئے

سب تازگی تو دن کے الاؤ میں جھونک دی
اب منتظر ہے بھاڑ چلو پانچ بج گئے

اپنی تو چائے پان کی عادت ہی پڑ گئی
ڈھونڈیں کوئی جگاڑ چلو پانچ بج گئے

کورا پڑا ہے رات کا کاغذ ابھی کہیں
دن کا پلندہ پھاڑ چلو پانچ بج گئے

آنکھوں سے صرف آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی بس
تن کی سنو دہاڑ چلو پانچ بج گئے

اس نے بھی آج سب کی طرح مجھ سے بات کی
کس کس سے لیں بگاڑ چلو پانچ بج گئے

تڑکا ہوا، اذان ہوئی، بدرؔ جی اٹھو
پھر کھل گئے کواڑ چلو پانچ بج گئے

غزل

کلیوں کی رگِ جاں میں رسن دیکھ رہا ہوں
بکھرے ہوئے پھولوں کے بدن دیکھ رہا ہوں

کچھ اور ضرورت ہے اسے میرے لہو کی
مقتل کو ابھی تشنہ دہن دیکھ رہا ہوں

وہ موت کے کاسے میں بھی سر ڈال رہے ہیں
کس گھر کی سخاوت کا چلن دیکھ رہا ہوں

اس دشت جنوں خیز سے اے خواب نکل جا
میں روح کو محتاج کفن دیکھ رہا ہوں

پابند سلاسل کی یہ رفتار کا عالم
میں وقت کے چہرے پر تھکن دیکھ رہا ہوں

ترسیں گے اجالوں کے لئے چاند ستارے
لگتا ہوا سورج کو گہن دیکھ رہا ہوں

کیا صبر کی تکمیل اسی روز ہوئی ہے
زنجیروں میں اک قلعہ شکن دیکھ رہا ہوں

رفیع سرسوی
عقب امبیڈکر پارک، نزد وجئے میموریل اسکول، محلہ چیورا، امروہہ
موبائل: 9319017118

غزل

اک چراغ کیا جلا شہر ستم شعار میں
چیں بہ جبیں ہوئی ہوا شہر ستم شعار میں

پیر فلک کا ان دنوں اور ہی کچھ مزاج ہے
خیر کی مانگئے دعا شہر ستم شعار میں

واعظ محترم کے ساتھ بک گئے اہل دلق بھی
یہ بھی ہوا ہے سانحہ شہر ستم شعار میں

شرم سے جھک گئی نظر انجم و ماہتاب کی
دیکھ کے اس کو برہنہ پا شہر ستم شعار میں

ہونٹ سلیں کہ سر کٹے کرتا رہوں گا برملا
تیرا ہی ذکر جا بہ جا شہر ستم شعار میں

پرچم حق لئے ہوئے جب بھی کوئی اٹھا نیازؔ
سر کا مطالبہ ہوا شہر ستم شعار میں

ڈاکٹر نیاز سلطانپوری
بھٹی جرولی، پوسٹ کٹاواں، سلطانپور
موبائل: 8756228058

غزل

انتقام ضربت کا اس طرح لیا جائے
جب بھی زخم دے کوئی مسکرا دیا جائے

جب خزاں نوازی ہی اپنا مشغلہ ٹھہرا
انتظارِ فصلِ گل کس لئے کیا جائے

کوئی حد بھی ہوتی ہے جشنِ خود فریبی کی
وہ ہنسی ہنسوں کب تک جو ہنسی ہنسا جائے

دیکھیں کیسے آتی ہے پھر یہ شامِ مایوسی
لاؤ آج سورج کو قید کر لیا جائے

جب سماعتوں میں اور بات میں ہو فنکاری
کس سے کیا کہا جائے کس سے کیا سنا جائے

بھائی بھائی کا دشمن بیٹا باپ کا دشمن
بولو ایسے عالم میں کس طرح جیا جائے

چہروں کو پرکھنا تو سہل ہے ذکیؔ لیکن
دوستوں کے ذہنوں کو کس طرح پڑھا جائے

ذکیؔ طارق
سعادت گنج، بارہ بنکی
موبائل: 7007368108

غزل

ہر سعی ہو نہ جائے کہیں رائیگاں جناب
منزل کہیں ہے اور کہیں کارواں جناب

جس میں چھپا ہوا ہے میری زندگی کا راز
کیسے سناؤں آپ کو وہ داستان جناب

اُس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اَنا کا خوں
کہتا ہے خود کو فکر کا وہ آسماں جناب

شہرِ وفا میں ٹوٹ کے چاہا تھا کل جسے
اُس نے ہی توڑ ڈالا ہے دل کا مکاں جناب

اک نوشگفتہ پھول کا چہرہ اُداس ہے
فصلِ بہار بن گئی فصلِ خزاں جناب

ظالم نے توڑ ڈالا مرے دل کا آئینہ
میں چن رہا ہوں بکھری ہوئی کرچیاں جناب

جاویدؔ ہر طرف ہے لگی آگ باغ میں
اب کس طرح بچے گا مرا آشیاں جناب

مشتاق جاویدؔ
P-121، نزد مدینہ مسجد، مٹیا برج، کلکتہ
موبائل: 9674170148

غزل

کون کہتا ہے وفادار سمجھ لیتے ہیں
زندگی آ تجھے اک بار سمجھ لیتے ہیں

روز سن لیتے ہیں افسانہ سمجھ کر خبریں
اور افسانوں کو اخبار سمجھ لیتے ہیں

میں تو سو بار چھپاتا ہوں تاثر لیکن
لوگ پھر لوگ ہیں ہر بار سمجھ لیتے ہیں

اوڑھ لیتے ہیں اجالے کی سنہری چادر
دھوپ کو سایۂ دیوار سمجھ لیتے ہیں

ایک وعدے کے عوض جان کی قیمت کیا ہے
لفظ کو جبہ و دستار سمجھ لیتے ہیں

دیکھ اس گاؤں کی چوپال میں بیٹھے بیٹھے
ہم نرے شہر کی رفتار سمجھ لیتے ہیں

اک پرچھائیں سے میں بھاگ رہا ہوں بابرؔ
جس کو کچھ لوگ مرا بار سمجھ لیتے ہیں

بابرؔ شریف
غزل آرٹ گیلری، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگپور
موبائل: 9890448379

غزل

گفتگو اپنی پر اثر رکھنا
اپنے لہجے کا بھی ہنر رکھنا

ہم تو گمراہ ہوگئے یاروں
اپنے دل کی ذرا خبر رکھنا

ہم تو مر کر بھی سرفراز رہے
کیا ضروری ہے تن پہ سر رکھنا

ہے کڑی دھوپ میں سفر یارب
میری راہوں میں اک شجر رکھنا

آنکھ میں گر خوشی کے ہیں آنسو
رنج و غم اپنے معتبر رکھنا

جس جگہ آسماں مقید ہو
کیا ضروری ہے بال و پر رکھنا

جسکی شاخوں میں ہو لچک اے صغیرؔ
اپنے آنگن میں وہ شجر رکھنا

صغیر عابدی
مفتی گنج، لکھنؤ
موبائل: 9415102296

غزل

جو ڈھلتی ہے تبسم میں فغاں ایسی بھی ہوتی ہے
کسی کے دل کی تکلیفِ نہاں ایسی بھی ہوتی ہے

اثر کرتی ہے دل پر ضبط گریہ ہو نہیں پاتا
چھلک پڑتی ہیں آنکھیں داستاں ایسی بھی ہوتی ہے

پتہ کچھ دوستی و دشمنی کا چل نہیں پاتا
یہاں پر سازشِ اہل جہاں ایسی بھی ہوتی ہے

ابھرتی ہے لکیریں ناگواری کی رُخِ گل پر
بہاروں میں بہارِ گلستاں ایسی بھی ہوتی ہے

لرز اٹھتا ہے انساں آدمیت کانپ جاتی ہے
جفا دنیا میں زیر آسماں ایسی بھی ہوتی ہے

پہنچ سکتی نہیں اس تک کبھی تیری بلندی بھی
کسی کی خاکِ پا اے آسماں ایسی بھی ہوتی ہے

جو کہنا چاہتے ہیں وہ منورؔ کہہ نہیں پاتے
کبھی مجبوریٔ لفظ و بیاں ایسی بھی ہوتی ہے

منور سلطانپوری
مکان نمبر 1533، محلہ شاستری نگر، سلطانپور
موبائل: 8009202986

غزل

اپنے کو پھول سا بنا لینا
خوشبو کی اک ہوا بنا لینا

تاکہ فرعون وقت مر جائیں
نیل میں راستہ بنا لینا

اک ہنسی، زخمِ دل کو بھر دے گی
چاہو تو یہ دوا بنا لینا

گوشِ عالم میں جو جلوس کرے
خود کو ایسی صدا بنا لینا

جس میں سارا فسانۂ دل ہو
ایسا اک زمزمہ بنا لینا

دل جلے، ہنس کے پھول بن جائیں
بستی میں وہ فضا بنا لینا

تم ندیؔ گر فدا حسینؑ پہ ہو
دل میں اک کربلا بنا لینا

بنت زہرا نقوی ندیؔ الہندی
ابوطالب اپارٹمنٹ، نخاس، لکھنؤ
موبائل: 9335276180

غزل

ایسی پہلے تھی کہاں اپنے سفر کی صورت
اب تو رستوں میں نظر آتی ہے گھر کی صورت

اس کو کاٹا ہے تو جلنے کے بھی کام آئے گا
زندگی جس نے گزاری ہے شجر کی صورت

اس کی تصویر سجی ہے تو سجی ہی ہوگی
خانۂ دل میں نہیں کوئی بھی ڈر کی صورت

اب نظر والوں کی عقلوں کا خدا ہی حافظ
دیکھنے آئے سرِ شام سحر کی صورت

اب یہ خواہش ہے کریں لوگ ہماری غیبت
پھیل جائیں تری گلیوں میں خبر کی صورت

بھولنا اس کا گوارا تو نہیں تھا ہم کو
کیوں دعاؤں میں نظر آئی اثر کی صورت

اب مرے پاؤں خلاؤں میں سفر کرتے ہیں
میں نے دیکھی ہے بہت خواب میں پر کی صورت

سید بصیر الحسن وفا نقوی
4/114، ہلال ہاؤس، محلہ نگلہ، سول لائن، علی گڑھ
موبائل: 9219782014

غزل

فکر رنج و غم نہیں لطف و طرب کچھ بھی نہیں
شوق میں دیدار کے آگے طلب کچھ بھی نہیں

راہ تکتی ہیں منازل مردِ دور اندیش کی
جس کی نظروں میں فصیلِ روز و شب کچھ بھی نہیں

کشتیٔ تشکیک میں بھی کام آئی چاندنی
عاقبت اندیش سے روپوش اب کچھ بھی نہیں

خونِ ناحق سے رنگی جاتی ہے لوحِ ہست و بود
سَدِّ حکمِ نیستی کیا میرے رب کچھ بھی نہیں؟

میں تو خاموشی کے پردے میں چھپا لونگا تجھے
کون مانے گا تباہی کا سبب کچھ بھی نہیں

روشنی کا ساتھ دینے لگ گئیں پرچھائیاں
کوچۂ شیشہ گراں ٹھہرا، عجب کچھ بھی نہیں

سوئے دریا لے کے جاتا ہے اثرؔ اپنی بیاض
کیا جہاں میں وقعتِ شعر و ادب کچھ بھی نہیں؟

مرغوب اثرؔ فاطمی
روڈ نمبر ے، محلہ علی گنج، گیا (بہار)
موبائل: 9431448749

ڈاکٹر حسن مثنیٰ کے انتقال پر ملال کے بعد ڈاکٹر ریحان حسن نے ان کی یاد میں مختلف قلم کاروں کے تاثراتی مضامین اوران کی چند کتابوں پر تبصراتی تحریر یکجا کر کے انہیں ''تجزیات ۔ بیاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ'' کے نام سے شائع کیا اور عین مجلس چہلم میں اس کتاب کی رسم رونمائی کی ۔ ۲۷۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل ۴۱ مضامین ہیں جنھیں چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر ریحان حسن نے اعتراف کے تحت ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے ۔جس میں اپنے خاندان اور وطن مالوف گوپالپور کے قیام کی تاریخ لکھی ہے ۔ مقدمہ کافی معلوماتی، دلچسپ اور کارآمد ہے۔انھوں نے اپنے نانیہالی اور دادیہالی دونوں خاندانوں میں ادب کی روایت اور ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ اسی مضمون میں ریحان حسن نے گوپالپور کے قیام کی تاریخ بھی رقم کی ہے جو مختلف روایات پر مبنی ہے۔ یہ حصہ اہل سیوان اور بالخصوص تاریخ سے شغف رکھنے والے قارئین لیے کافی کارآمد ہے۔ زہیر حسن نے ڈاکٹر حسن مثنیٰ کے حالات وکوائف لکھے ہیں جن میں ان کی زندگی اور ادبی خدمات کے متعلق تمام تفصیلات درج ہیں ۔''تجزیات : بیاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ'' کا پہلا باب تنقید وتاثر ہے۔اس میں کل تیرہ مضامین ہیں ۔تمام مضامین یادداشت پر مشتمل ہیں اور تاثراتی ہیں۔فاضل قلم کاروں نے حسن مثنیٰ کی قبل از وقت وفات پر رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور اپنے اپنے روابط میں ان کے اخلاق نیک سیرت اور اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

مرزا ببر علی انیس کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اردو شاعری کے ذخیرے میں مختلف طریقے سے گراں قدر اضافے کیے ہیں ۔لیکن ادب میں ان کی شناخت مرثیہ گوئی میں قائم ہوئی۔ان سے ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا لگاؤ قلبی تھا اور انھیں یہ لگاؤ وراثت میں ملا تھا۔ اعتراف کے تحت ڈاکٹر ریحان حسن لکھتے ہیں ۔''میر ببر علی انیس سے بے پایاں عقیدت میں جہاں گوپالپور میں ہونے والی مجالس ومحافل کا دخل ہے وہیں خاندانی وراثت کا کچھ کم حصہ نہیں ۔ والد محترم سید محمد نعیم رضوی کو انیس سے والہانہ عشق تھا۔ ملازمت کی مصروفیت کے باوجود گھر میں اکثر و بیشتر میر انیس اور مرزا دبیر کا کلام ہی سناتے بلکہ ان خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے بچوں میں سے کسی کو انیس کے مرثیے پڑھنے کی تربیت بھی کسی مرثیہ خواں سے دلائیں۔''ص،۸

ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے میر ببر علی انیس کے تعلق سے دو کتابیں ترتیب دی ہیں ۔پہلی کتاب انیس اور انیس شناس ہے۔میر انیس پر لکھنو میں ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔اس سمینار میں پڑھے گئے مقالے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ دوسری کتاب انیس کا شعور فن ہے۔ جو مختلف رسائل وجرائد شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ ان دونوں کتابوں کے مرتب ڈاکٹر حسن مثنیٰ ہیں ۔تجزیات ۔ بیاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ میں ان دونوں کتابوں پر چھ مضامین ہیں ۔ یہ مضامین مختصر ہیں لیکن جامع ہیں ۔تحریر کا انداز معروضی ہے۔ان سے ڈاکٹر حسن مثنیٰ کی انیس کی شاعری سے محبت اور ان کی شخصیت سے

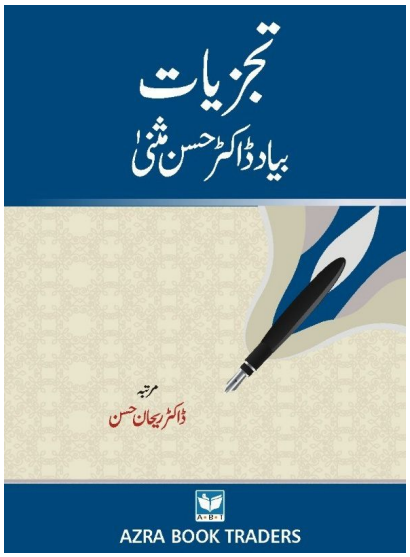

مبصر : ڈاکٹر ارشاد احمد

قیمت : 300 روپے

ناشر : عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی

ملنے کا پتہ

عذرا بک ٹریڈرس، نئی دہلی

ذہنی وقلبی لگاؤ کی وضاحت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں قیام کے دوران ہندوستان کے غیر ممالک کے نیوز چینل کی خبروں کی مانیٹرنگ کا کام کیا تھا یہ کام سینٹرل مانیٹرنگ ایجنسی کے تحت ہوتا تھا۔آج اس ادارے کا نام این ٹی آر او (NTRO) ہو گیا ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ سے ان کا پہلا سابقہ تھا۔اس کے بعد اردو صحافت سے اپنی ملازمت کی ابتدا کی ۔اسی وقت ان کی کتاب 'ریڈیو نشریات: آغاز وارتقا' منظرِ عام پر آئی جسے اردو داں طبقے میں خاصی پذیرائی ہوئی ۔واضح ہو کہ اہلِ اردو کے لیے یہ کتاب موضوع اور مواد کے اعتبار سے منفرد تھی اس لیے ہاتھوں ہاتھ لی گئی ۔ذرائع ابلاغ سے متعلق موصوف کی دوسری کتاب 'میڈیا قانون اور سماج' ۲۰۱۵ میں طبع ہوئی ۔پیشِ نظر کتاب کے باب سوم میں مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے متعلق سات مضامین ہیں ۔سارے مضامین معیاری، معلوماتی، پر اثر اور پر لطف ہیں۔اردو میں اس طرح کی کتابوں کا فقدان ہے۔ڈاکٹر حسن مثنیٰ کے مضامین کا مجموعہ ذرّہ بھر روشنی ۲۰۱۳ میں شائع ہوئی۔اس کتاب پر چار مضامین باب چہارم میں شامل ہیں ۔معتبر قلم کاروں نے ان مضامین میں ان کی تنقید نگاری کا جائزہ کتاب مذکور کے حوالے سے لیا ہے۔ ان مضامین سے موصوف کی تنقیدی بصیرت، باریک بینی اور ژرف نگاہی کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔پانچواں باب اس کتاب کا ماحصل ہے۔ اس میں کل گیارہ مختلف النوع مضامین ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر حسن مثنیٰ کی ادبی خدمات، نیک اور فعال شخصیت، سوانح نگاری (مونوگراف) تنقیدی بصیرت، تفہیم غالب اور ترجمہ نگاری (تلاش نا تمام) جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔فاضل قلم کاروں نے بہت ہی کم مدت میں لائق تحسین اور قابلِ مطالعہ مقالے تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب کے آخری باب میں چندر بھان خیال کا منظوم خراجِ عقیدت 'حسن مثنیٰ کہاں گئے تم' اور عراق رضا زیدی قطعہ تاریخ ہے۔

یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر حسن مثنیٰ بہت کم ہی عمر میں داغِ مفارقت دے گئے ۔یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے مختلف قلم کاروں سے دوسرے حضرات پر ڈھیروں مضامین لکھوائے اور ترتیب دے کر شائع کرایا، لیکن اپنے اوپر لکھنے کے لیے کبھی زبان نہیں کھولی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم عصر ناقدین نے ان کی تنقید نگاری پر توجہ نہیں دی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں موصوف کے مقام ومرتبے اور قدر و قیمت کے تعین کا کام ابھی باقی ہے۔ میں یہ کام اردو کے مستند و معتبر ناقدین کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے ''تجزیات: بیاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ'' جیسی کتاب اردو ادب میں ان کے مقام ومرتبے کے تعین میں معاون ومددگار ثابت ہوگی۔طباعت دیدہ زیب ہے۔کتابت کی غلطیاں ایک آدھ ہیں۔ قیمت مناسب ہے۔

❑❑❑

فکشن کے حوالے سے گلزار سنگھ سندھو پنجابی زبان کا ایک اہم اور معتبر نام ہے ان کا قلم ابھی بھی اپنی تخلیقی جولانیاں بکھیر رہا ہے بقول مترجم ان کے اب تک نوے سے زیادہ افسانے اور نصف درجن ناول ادب کی دنیا میں متعارف ہو چکے ہیں جن کو خاطر خواہ پذیرائی اور داد وتحسین مل چکی ہے۔انھیں ساہتیہ اکادمی جیسے ادارے سے بھی افسانے پر اعزاز مل چکا ہے۔

ترجمہ ایک مشکل اور نہایت دقت طلب امر ہے اس دشت کی سیاحی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔نثری پارے کا ترجمہ تو پھر بھی غنیمت ہے لیکن نظم میں تو یہ کارِ محال ایک بھاری پتھر کے مانند ہے جس کو ہر کوئی چوم کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ترجمہ نگاری کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں کے رموز و اسرار سے لے کر علائم، استعارات، رسومیات اور ان کی تہذیب وثقافت سے خاطر خواہ واقفیت ہو۔ورنہ عصمت چغتائی کا مشہور افسانہ 'چوتھی کا جوڑا' انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر Bridal Suit ہی کہلائے گا کیونکہ ترجمہ نگار کو چوتھی کے جوڑے کے پس پردہ جو روایت ہے اس سے عدم واقفیت ہے یا یوں کہا جائے کہ ولایتی تہذیب میں شادی کے بعد چوتھی کی رسم سے ملتی جلتی کوئی رسم ہی نہیں ہوگی۔ایسی صورت میں مترجم قاری کو اپنے اصل متن کی تفہیم وتعبیر یکسر سے دور کر دیتا ہے اور بلاوجہ کوئی فن پارہ تجریدیت اور ابہام کا شکار ہو جاتا ہے۔خدا کا شکر ہے کہ علی عباس اس مرحلے سے بہت کامیاب اور کامران گزرے ہیں کیونکہ میں نے ان کے ترجمہ شدہ بیشتر افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔افسانوں کی کہانی میں زبان وبیان کے حوالے سے جو ایک قدرتی بہاؤ یا روانی ہوتی ہے وہ کہیں بھی ٹوٹتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے۔'آخری تنکا' کے منتخب افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اس کے مصنف گلزار سنگھ سندھو کی افسانوی بنت یا افسانوی دستکاری کے ہنر پر کافی گرفت محسوس کی ہے۔

تقسیم ہند کا المیہ تو ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب ہے جس کا کرب اور کسک نسلیں جھیل رہی ہیں۔

اسی طرح گلزار سنگھ سندھو کا 'آخری تنکا' بھی نام بٹوارے کی کرب ناک داستان کو اپنا موضوع بناتا ہے جس میں تمام رشتوں کے بٹ جانے کے بعد ایک امٹ رشتہ یعنی انسان دوستی، پیار محبت اور امن کا رشتہ ہمیشہ بنا رہتا ہے ۔افسانہ نگار نے بھی اپنے افسانے میں تقسیم جیسے خونی واقعات میں بھی انسان دوستی کی ایک شمع جلائی ہے۔اس کہانی کا ہیرو چندن تقسیم کی بھینٹ چڑھی بے سہارا لڑکی رجّو کو اپنے گھر میں پناہ دے کر اپنی ماں اور سماج کے لعن طعن کا شکار ہوتا ہے لیکن تمام پریشانیوں اور اختلافات کے باوجود رشتہ کی ایک ڈور اسے رجو سے جوڑے رکھتی ہے اور وہ اس کو اپنی بیوی کے روپ میں بھی دیکھتا ہے جس کی اجازت نہ تو اس کی ماں دیتی ہے اور نہ ہی انسانوں کا بنایا ہوا نظام۔آخر میں وہ انسانوں کے بنائے ہوئے اس فرسودہ نظام کا شکار ہو کر تھک جاتا ہے اور رجّو کو ان ہندوستانی

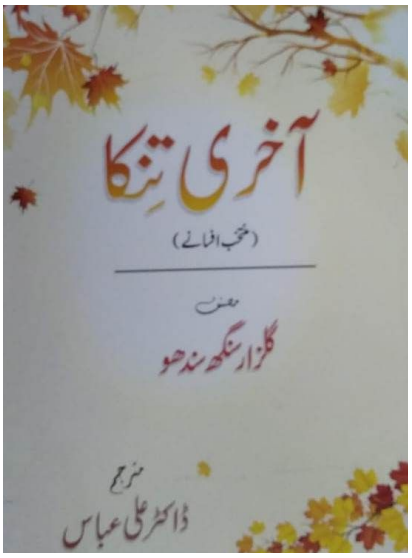

مبصر : ڈاکٹر منتظر قائمی

قیمت : 200 روپے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔٦

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔٦

افسروں کی گرفت سے نہیں بچا سکتا ہے جب وہ اسے چندن کے گھر سے جبراً پاکستان جانے پر مجبور کر دیتے ہیں اس کو پاکستان جانا ہی پڑتا ہے اور افسانہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے اور ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے۔

'بلیوں کا رونا' بھی گلزار کا ایک عمدہ افسانہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد کچھ ایسی اساطیری اور ماورائی کیفیت چھا جاتی ہے کہ اردو کے بہترین افسانہ نگار راجیند رسنگھ بیدی کی یاد آجاتی ہے۔ ان کے بھی بیشتر افسانے میں اساطیریت کی ایک فضا پائی جاتی ہے جو کہانی کو ایک نئے نہج پر پہنچا دیتی ہے۔بظاہر یہ کہانی بھی ملک میں رونما ہونے والے سکھ فسادات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے مگر اس کی جڑیں اساطیریت میں جا کر پیوست ہو جاتی ہیں۔مترجم نے بجا فرمایا ہے کہ کوئی بھی مصنف اپنے ماضی سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا ہے۔کسی کے یہاں ماضی تکرار بن کر زندہ رہتا ہے کسی کے یہاں محض گزرا ہوا زمانہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ گلزار سنگھ سندھو کی کہانیوں میں ماضی ناقابل فراموش طوطے کی آواز بن کر زندہ رہتا ہے۔وہ ماضی کو تاریخ کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی کہانی کے کسی اہم کردار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ان کے افسانوں کے دیگر موضوعات پچھتاوا، سربازار لوٹ، حسن کے صیاد، ایکا کی موت، کمبخت، ٹھنڈا ہاتھ، بے گناہ لیلیٰ اور سانجھی ماں ہیں جن میں حقیقت نگاری کے تمام اصولوں اور نظریات کو برتتے ہوئے

بڑے ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کسی بھی کہانی میں کسی قسم کا کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی کہانی کے ذریعہ ہر لمحہ اور ہر قدم پر اپنے قاری سے جڑے ہوئے رہتے ہیں۔متن میں پیچیدگی، ابہام، الجھاؤ اور نت نئے تجربوں کے نزول نے قاری اور تخلیق کار کے رشتہ میں دوری پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ تجریدیت اور علامت کے سحر میں کہیں گم ہو گیا مگر گلزار سنگھ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد سے کسی کہانی کو اٹھا کر اس میں حقیقت نگاری کے ذریعہ فکشن کا جامہ پہنا کر قارئین کے ذوق کا سامان مہیا کرتے ہیں۔یہ علی عباس کی ترجمہ نگاری کی خلاقانہ صلاحیت ہے کہ وہ گلزار سنگھ سندھو کو اردو کے قارئین میں اصل زبان داں کی طرح متعارف کراتے ہیں۔وہ قاری کو کہیں سے بھی یہ محسوس نہیں ہونے کا موقعہ نہیں دیتے کہ وہ ترجمہ شدہ افسانے کا مطالعہ کر رہے ہیں۔اگر اس کتاب پر مصنف کی جگہ پر راجیند رسنگھ بیدی، کرشن چندر یا ایسا ہی کوئی معروف نام لکھ دیا جائے تو قاری کو ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوگا کہ وہ ان معتبر ناموں کے علاوہ کسی دیگر زبان کے تخلیق کار کی کہانیوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔اردو فکشن کے ساتھ زیادتی ہوگی اگر اتنے سادہ، سلیس اور غیر مبہم افسانوں کا کھلے دل سے استقبال نہ کیا جائے۔

❑❑❑

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی، گرو شری گورکھ ناتھ اسپتال، گورکھپور میں پاور گرڈ کارپوریشن کی جانب سے منعقد
'ایمبولنس وین کو عوام کے نام معنون کئے جانے والے پروگرام میں عوام کو خطاب کرتے ہوئے (۲۹ مئی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک نے راج بھون میں ۲۹ جون ۲۰۱۶ء کو قاضی عبدالستار، اقبال مجید، ارشاد امروہوی اور شمیم نکہت کی ادبی خدمات پر مرکوز ماہنامہ 'نیا دور'
کے خصوصی شمارے (اپریل ۲۰۱۹ء) کا اجراء کیا۔ تقریب رونمائی میں موجود نیا دور کے اراکین سید نازش احمد، 'معاون ایڈیٹر' شاہد کمال (دائیں) 'ایڈیٹر نیا دور' سید عاصم رضا، وقار حسین اور ڈاکٹر سلیم احمد

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

وزیراعظم جناب نریندر مودی کا وارانسی میں ایئر پورٹ پر استقبال کرتے ہوئے
اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک اور وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲۷ مئی ۲۰۱۹ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک اور وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی سابق وزیراعظم چودھری چرن سنگھ
کی برسی پر ودھان بھون کیمپس میں ان کی تصویر پر گل پوشی کر کے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے (۲۹ مئی ۲۰۱۹ء)

वर्ष : 74 अंक 1
मई 2019
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **f'kf'kj]** निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सैयद आसिम रज़ा**